انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

اپریل تا جون ۲۰۱۳ء

حیاتِ نو

مدیر: انیس احمد مدنی

مجلس ادارت:

مشرف حسین صدیقی فلاحی	دہلی
مقبول احمد فلاحی	لکھنؤ
ڈاکٹر عبدالباری فلاحی	دہلی
مولانا محمد اسماعیل فلاحی	جامعۃ الفلاح

فی شمارہ :	اندرون ملک	۳۰/روپے
	بیرون ملک	۵/امریکی ڈالر
سالانہ زرتعاون :	اندرون ملک	۱۲۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰/امریکی ڈالر
لائف ممبرشپ :	اندرون ملک	۳۰۰۰/روپے
	بیرون ملک	۲۰۰/امریکی ڈالر

- رجسٹرڈ ڈاک سے رسالہ منگانے کی صورت میں رجسٹری خرچ بذمہ خریدار ہوگا۔
- مقالہ نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

نمائندے

لندن :	رضوان احمد فلاحی
دہلی :	نعیم احمد غازی فلاحی
علی گڑھ :	ڈاکٹر ضیاء الدین ملک فلاحی
ممبئی :	حافظ ادہم علی فلاحی
نیپال :	نذر الحسن فلاحی
یو.اے.ای. :	خالد حسن رشید فلاحی
قطر :	محمد اکرم فلاحی
کویت :	محمد سموئیل فلاحی
سعودی عرب :	انعام اللہ فلاحی

خط وکتابت کے پتے

- برائے ادارتی امور

انیس احمد مدنی، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)

- برائے انتظامی امور و ترسیل زر

عرفان احمد فلاحی جامعۃ الفلاح، بلریا گنج
اعظم گڑھ (یوپی)-276121
موبائل: +91-9453757380
ای میل: hayatenau5@gmail.com

Layout Designing & Title Designing: **sajidkhalil**@gmail.com

Cell: +919999828273

نقوش حیاتِ نو

اداریہ

مسجد اور تعلیم	انیس احمد مدنی	۳

عظمت کے مینار

ہرم بن حیانؒ	مولانا افتخار الحسن مظہری	۵
حضرت ام سلیمؓ	ابوجلیس ندوی	۸

روشنی کا سفر

قبول اسلام	ام کلثوم	۱۳

بحث و نظر

حسن ترابی	ذکی الرحمٰن فلاحی	۱۵

مقالات

فہم قرآن	ادارہ	۴۲
جہیز یا وراثت	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی	۶۱
حدیث اور مستشرقین (۱)	انیس احمد مدنی	۶۸

جامعہ کے لیل و نہار	عبدالرقیب فلاحی	۷۳

مسجد اور تعلیم

مسجد، عہدنبوی میں عبادت گاہ کے ساتھ مکتب بھی تھی، یونیورسٹی بھی، دارالامارۃ تھی اور دارالقیادۃ بھی۔ نبی اکرم ﷺ تعلیم وتدریس کی غرض سے مسجد نبوی میں بیٹھتے اور صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کے اردگرد حلقہ بنا کر تعلیم کے لیے بیٹھ جاتے۔ آپ ﷺ نے مسجد نبوی کا ایک حصہ تعلیم گاہ کے طور پر مخصوص کردیا تھا اس مقام کو ہم ''صفہ'' کا نام دیتے ہیں۔ فتح الباری میں ہے کہ صفہ مسجد نبوی سے متصل ایک سائبان والا چبوترہ تھا جہاں فقراء ومساکین پناہ لیتے تھے۔ (ج ا ص ۵۳۵) یہ صفہ وہ مقام ہے جسے موجودہ زبان میں رہائشی جامعہ (Residential University) کہتے ہیں یعنی طلبہ کے رہنے کا بھی انتظام ہے اور تعلیم کا بھی۔

صفہ میں تعلیم پانے والے طالب علم دو قسم کے تھے، کچھ تو وہ تھے جو شہر میں رہتے تھے اور پڑھ کر چلے جاتے تھے لیکن کچھ ایسے تھے جن کا کوئی گھر نہیں تھا اور وہ رات بھی وہیں گزارتے تھے۔

آپ ﷺ نے مساجد میں ذکر وتلاوت اور عبادت کے ساتھ تعلیم کے مرکز کے طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:

من جاء مسجدی هذا لم يات الا بخير يتعلمه أو يعلمه فهو بمنزلة المجاهد فی سبيل الله ومن جاء لغير ذلك فهو بمنزلة الرجل ينظر الى متاع غيره (ابن ماجہ فی سننہ فی المقدمۃ، واسنادہ صحیح علی شرط مسلم) جو شخص میری اس مسجد میں کسی بھلائی کی بات کو سیکھنے یا سکھانے کی غرض سے آئے تو وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے مانند ہوگا اور جو اس کے علاوہ کسی اور مقصد کے تحت آئے تو وہ اس شخص کی طرح ہوگا جو دوسرے کے سامان پر نگاہ ڈال رہا ہو۔

مساجد میں علمی حلقوں کا قیام نہ صرف مشروع بلکہ رحمت خداوندی اور سکینت کے نزول کا ذریعہ بھی ہے۔ ارشاد رسول ﷺ ہے ما اجتمع قوم فی بيت من بيوت الله يتلون كتاب الله و يتدارسونه بينهم الا نزلت عليهم السكينة وغشيتهم الرحمة و حفتهم

الملائكة وذكرهم الله فيمن عنده ومن أبطأ به عمله لم يسرع به نسبه (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء) جو لوگ بھی اللہ کے گھروں میں سے کسی گھر میں، کتاب الٰہی کی تلاوت اور باہم اس کا مذاکرہ ومدارسہ کرتے ہیں ان پر سکینت اور طمانینت کا نزول ہوتا ہے، رحمت خداوندی انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ ان لوگوں کے درمیان کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور جس کا عمل اس کو مؤخر کردے تو اس کا نسب اسے آگے نہیں بڑھا سکتا۔

قرآن مجید میں مساجد کی تعمیر کے حقیقی اہداف پر روشنی ڈالتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انما يعمر مساجد الله من آمن بالله واليوم الآخر (سورۃ التوبہ) اکثر اہل علم کے نزدیک ''عمارۃ'' سے مراد نماز، ذکر تلاوت اور علم ہے۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ عمارہ میں مساجد کی تعمیر و مرمت، صفائی وروشنی اور ذکر وعبادت کے لیے وہاں کثرت سے آنا مراد ہے اور ذکر میں درس وتدریس بھی داخل ہے بلکہ یہ ذکر کی اعلیٰ وارفع ترین شکل ہے۔

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں مساجد کا استعمال ان اہداف میں ہوتا رہا۔ چنانچہ بغداد کی جامع المنصور ایک نہایت ہی اعلیٰ مدرسہ تھا اور تمام اہل علم کا مرکز، یہ اتنا بڑا مدرسہ تھا کہ خطیب البغدادی نے حرم شریف میں جن تین باتوں کے لیے دعا مانگی تھی، ان میں پہلی بات یہ تھی کہ انھیں اس مدرسہ میں پڑھانے کا موقع نصیب ہو۔ (الخطیب، تاریخ بغداد ج ا ص ۱۰۸)

جامع دمشق بھی ایک تعلیمی مرکز تھی، ابن جبیر کا بیان ہے کہ اس مسجد میں درس کے متعدد حلقے قائم تھے۔ مالکی طلبہ اس مسجد کے مغربی گوشہ میں اور شافعی طلبہ داخلی دروازہ باب البرید کے بائیں جانب پڑھتے تھے (الرحلہ: ۲۷۱) خطیب البغدادی کا حلقہ درس بہت وسیع ہوتا تھا، جہاں بے شمار سامعین ہوتے تھے۔ (معجم الادباء) جامع عمرو مصر میں تو چالیس علمی حلقے قائم تھے۔ (الخطط، المقریزی ص ۳۱۶)

ہندستان میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے ازالہ کے لیے مساجد کی مذکورہ بالا حیثیت کو اگر دوبارہ بحال کردیا جائے اور ائمہ مساجد اپنے فرائض وواجبات کو ادا کرنے لگیں تو نہ صرف تعلیمی پسماندگی کا ازالہ ہوگا بلکہ اس امت میں پھر ابن سینا، رازی، ابن رشد اور فارابی جیسے حکماء پیدا ہوں گے جو دنیاوی علوم کو دین اسلام کا خادم بنا کر ان کے ذریعہ اسلامی مسائل واحکام کی برتری وحقانیت تمام دنیا پر ثابت کردکھائیں گے۔

☆☆☆

ہرم بن حیانؒ

افتخار الحسن مظہری ☆

ہرم بن حیان حضرت حممہ رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے۔ایک بار رات کو ان کے یہاں قیام کیا۔دیکھا کہ رات کو رونا شروع کیا تو صبح تک روتے ہی رہے۔ان سے رہا نہ گیا، آخر پوچھ ہی لیا۔ادب سے عرض کیا کہ رات بھر رونے کی کیا وجہ تھی؟ کوئی تکلیف ہو تو میں مدد کروں۔

حممہ رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: کسی تکلیف سے نہیں رو رہا تھا۔شب میں اچانک وہ رات یاد آ گئی جو اس دنیا کی آخری رات ہوگی اور صبح ہوتے ہی اس دن قبروں سے تمام مردے زندہ کر کے اٹھا دیے جائیں گے اور سارے انسان میدانِ محشر کی طرف تیز گام ہوں گے۔

پھر ایک بار حضرت حممہ رضی اللہ عنہ اپنے شاگرد ہرم بن حیان کے گھر تشریف لے گئے۔رات وہیں قیام کیا تو دیکھا کہ ہرم رات میں ایک لمحہ بھی نہ سوئے۔پوری رات رو رو کے گزار دی۔انھوں نے بھی شاگرد سے رونے کا سبب پوچھا۔

شاگرد نے کہا: شب میں زندگی کی وہ آخری رات یاد آ گئی جب آسمان سے سارے ستارے ٹوٹ کے بکھر جائیں گے۔اس ہولناک منظر کی یاد نے دل میں ایسی ہیبت ڈال دی کہ پوری رات آنسوؤں میں ڈوبی رہی۔دونوں استاد و شاگرد دن میں بھی اکثر ساتھ ساتھ رہا کرتے تھے۔دونوں ایک ساتھ پھول مالا والی بازار جاتے تھے۔وہاں پھولوں کو دیکھ کر جنت کی یاد آ جاتی اور دونوں اللہ سے جنت کی دعا مانگنے لگتے۔پھر دونوں ایک ساتھ لوہار کے پاس جاتے، اس کی دہکتی ہوئی بھٹی دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے اور اللہ سے رو رو کے نارِ دوزخ سے بچنے کی دیر تک دعا مانگتے۔پھر وہاں سے اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے۔ (الزھد لاحمد:۲۳۱)

ان لوگوں کی زندگی کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ شاید وہ آخرت کو دیکھ کے آئے ہیں اور یہاں کی ہر ہر چیز کو دیکھ کر آخرت میں دیکھی ہوئی چیزوں کو یاد کرنے لگتے ہیں اور اپنے نفس کو آخرت کا شیدا بنانے کی ہمہ تن کوشش کرتے تھے تاکہ اس کو آسانی سے رام کیا جا سکے۔تابعین نے صحابہ کرام

☆ استاذ حدیث، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

سے تربیت کا یہی سبق پایا تھا۔

ریا و خود پسندی کے خلاف محاذ آرائی

عوام میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے اور لوگ تعریف و توصیف کرنے لگیں تو اس سے نفس میں خود پسندی وغرور پیدا ہو کے رہتا ہے۔ایسے موقعوں پر تابعین عظام بہت چوکنا رہتے اور ڈرتے رہتے کہ کہیں اس کی وجہ سے ان کے اعمال رائیگاں نہ ہو جائیں۔ایک بار ہرم بن حیان کو کوئی ذمہ داری سونپی گئی۔انھوں نے سوچا کہ لوگ منصب کی مبارکباد دینے ضرور آئیں گے، اس سے دل میں خود پسندی پیدا ہو سکتی ہے۔اس سے بچنے کے لئے انھوں نے آگ کے الاؤ جلوائے، لوگ آئے تو دور ہی سے سلام کرنے لگے۔انھوں نے کہا آپ لوگ قریب آ جائیے۔لوگوں نے کہا آگ بیچ میں حائل ہے، ہم آپ کے قریب کیسے آ سکتے ہیں؟ تب ہرم بن حیان نے کہا، تو پھر آپ لوگ مجھ کو اس سے بڑی آگ میں جھونکنے کے درپے کیوں ہیں؟ یہ سن کے لوگ واپس لوٹ گئے۔ (الزھد لاحمد: ۲۳۲)

یہ بات ممکن ہے بعض لوگوں کو ناگوار معلوم ہو، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ریا و گھمنڈ کا خوف ان کو اتنا زیادہ تھا کہ اس سے بچنے کے لئے اتنی سختی ناگزیر تھی۔

اللہ کے خوف کی زیادتی

لوگوں میں سب سے زیادہ ہوشمند عبادت گزار لوگ ہیں جو چیز نفع بخش ہے اس سے وہ قربت رکھتے ہیں اور جو چیز ضرر رساں ہے اس سے دامن کشاں رہتے ہیں۔جب انسان کی عقل ماری جاتی ہے اور وہ خواہشات نفس کا غلام ہو جاتا ہے تو اس کا رویہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ہرم بن حیان کو اس شخص پر بڑی حیرت ہوتی جو جہنم سے ڈرنے کا شور مچائے اور رات بھر خراٹے لے لے کے سوئے اور اس سے بچنے کی تدبیر و کوشش نہ کرے۔اسی طرح اس شخص پر بھی ان کو بڑا تعجب ہوتا جس کو جنت کی تمنا ہو لیکن جنت کے اعمال سے غافل ہو۔وہ کہا کرتے تھے:

میں نے کسی کو ایسا نہیں دیکھا کہ جہنم سے بچنا چاہے اور رات بھر سوئے اور ایسا بھی کسی کو نہیں دیکھا کہ جنت کا آرزومند ہو اور رات بھر سوئے۔ (الزھد: ۲۳۱)

ان کو خوفِ خدا اس قدر تھا کہ حساب کے لئے پیشی کے خوف سے یہ تمنا کرتے تھے کہ کاش پیدا ہی نہ ہوئے ہوتے۔صحابہ میں حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما بھی ایسی تمنا کیا کرتے تھے۔ایک

بار ہرم بن حیان حجاز کے سفر پہ نکلے، ساتھ میں عبداللہ بن عامر بھی تھے۔ اتفاق سے ان کا گزر ایک ایسی جگہ سے ہوا جہاں پیڑ پودے تھے۔ ان کے اونٹ پیڑ پودوں سے جی بہلانے لگے۔ ابن حیان نے عامر سے کہا کہ بتاؤ یہ بات تمہارے لئے خوشی کی تھی یا نہیں کہ تم بھی ایک درخت ہوتے۔ جانور تم کو کھا کر مینگنیاں بناتے اور پھر مینگنیوں سے اپلے بنائے جاتے۔ عامر نے کہا ہرگز خوشی نہ ہوتی، مجھے تو اللہ کی رحمت مترقبہ زیادہ عزیز ہے۔

ابن حیان نے کہا: میری تو یہ تمنا ہے کہ کاش میں بھی ایک درخت ہوتا، یہ اونٹنی مجھے کھاتی، پھر مجھے مینگنیاں بناتی اور پھر مینگنیوں سے مجھ کو اپلہ بنایا جاتا تاکہ قیامت کے دن حساب و کتاب سے بچ جاتا۔ عامر! مجھے تو قیامت کا بڑا ڈر لگتا ہے۔ (الزھد: ۲۳۳)

عمل کی مداومت

عمل کی مداومت کو اصلاح نفس کے لئے بڑی اہمیت ہے۔ عمل ہی تزکیہ کی بنیاد ہے۔ عمل ایمان کا ہمزاد ہے، جہاں عمل نہ ہو وہاں ایمان بھی نہیں ٹھہرتا۔ ابن حبانؒ فرماتے ہیں اگر مجھے کہہ دیا جائے کہ تم جہنمی ہو تب بھی میں عمل کو نہیں چھوڑوں گا تاکہ میرا نفس مجھ کو ملامت نہ کرے اور یہ نہ کہے کہ تم نے کیوں عمل نہیں کیا؟ (صفۃ الصفوۃ: ۲۱۴/۳)

خاتمہ بالخیر

حضرت حسنؒ سے منقول ہے کہ ابن حبان نے ایک غزوہ میں سخت گرمی کے دنوں میں وفات پائی۔ جب ان کی تدفین ہوئی تو ایک بادل کا ٹکڑا ان کی قبر کے اوپر آیا اور صرف ان کی قبر پر چھڑکاؤ کیا۔ ایک قطرہ بھی قبر کے ادھر ادھر نہیں گرا اور قبر کو سیراب کر کے جہاں سے آیا تھا وہاں چلا گیا۔ (الزھد: ۲۳۴)

تابعین کے نزدیک تربیت نفس کا یہی مفہوم وسیع تھا۔ وہ تربیت کو صرف مسجد و مدرسہ سے نکل کر میدان کارزار تک پھیلی ہوئی تھی۔ دشمنانِ دین سے محاذ آرائی، جان و مال، زبان و قلم اور شمشیر و سناں کے ذریعہ جہاد فی سبیل اللہ بھی تربیت نفس کے لازمی وسائل تھے۔ جو شخص تربیت کے اس مفہوم و معنی کے مطابق اپنی زندگی سنوار لے، ضرور اللہ تعالیٰ اس کے خاتمہ بالخیر کی بشارتیں ظاہر کرے گا، خواہ رحمت کے بادل کی پھوار کی شکل میں یا کسی اور شکل میں۔ ☆

حضرت ام سلیمؓ

مولانا ابوجلیس ندوی☆

عورت انسان کی آرزو کا فروغِ جمال ہے، وہ نہ ہو تو ساز و نغمہ کی دھن پہ رقص کرتی ہوئی راتیں بے کیف اور شادیانوں کی گونج میں چہکتے ہوئے دن نشاط و تازگی سے محروم رہتے ہیں، وہ ہو تو صحرا بھی گلزار، ویرانہ بھی آباد و شاد، خزاں کی رت میں بھی خیمہ ہائے بہار کی قطاروں کا منظر جشن و سرور، کسی نے خوب کہا ہے۔

ہر سمت لطافت ہی لطافت سی لگے ہے
تم ہو تو یہ دنیا مجھے جنت سی لگے ہے

لیکن یہ عجیب سانحہ ہے کہ خوابوں کے محل کو آباد رکھنے والی یہی دلربا انسان کی سب سے زیادہ معتوب و مقہور رہی ہے، انسان کی معلوم تاریخ کا ہر عہد عورت کی مظلومیت، مجبوری و بدنصیبی اور اس کی تذلیل و تحقیر کی داستان کا ایک الم انگیز باب ہے۔

گذشتہ تاریخی ادوار میں عورت کو جن مشکلات و مسائل، مصائب و آلام کا سامنا تھا آج وہ اس کے لیے روز مرہ کا معمول بن گئے ہیں۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ عورت پر ڈھائے جانے والے ان مظالم کے خلاف ہر دور میں آوازیں اٹھتی رہی ہیں لیکن ان کے سد باب کے لیے مخلصانہ کوششیں نہیں کی گئیں یا کی گئیں تو بار آور نہ ہو سکیں۔

ہمارا یقین ہے کہ عورت کو اگر اسلام کا سایۂ رحمت ملے اور اس کے پاکیزہ ماحول اور فضا کی برکتیں اسے نصیب ہوں تو وہ ہوس کی درندگی کا نخچیر بننے کے بجائے انسان کی آنکھوں کا تارا بن جائے، ذلت و خواری کی غلیظ دلدل سے نکل کر آستانۂ عظمت و حرمت بن جائے، سر پھرے نوجوانوں کی دست درازی کا شکار ہونے کے بجائے ان کی عزت و حمیت کی لاج بن جائے۔

☆استاذ حدیث، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

اگر یہ دیکھنا ہو کہ عورت انسان کی آنکھوں کا تارا اور اس کی تعظیم وتوقیر کا مظہر اتم کب اور کیسے بنی تھی تو آیئے اسلام کے زیر سایہ رہتے ہوئے عورت نے جو جو کمالات دکھائے ہیں، ان کمالات سے کچھ آگاہی حاصل کی جائے، آپ کو صحیح معنوں میں اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ عصر حاضر کی مظلوم ومقہور عورت، جدید تہذیب کی صلیب پر لٹکی ہوئی مریم، ہوس کی درندگی سے پامال سیتا، حق آدمیت سے محروم رادھا اور اپنے وجود سے شرمسار بنت حوا کے لیے اسلام کے دامانِ رحمت کے سوا کہیں کوئی جائے پناہ نہیں ہے۔ کاش عصر حاضر کی عورت اس حقیقت سے آشنا ہو جائے۔

اسلام کے اولین عہد میں ایک خاتون ام سلیمؓ گذری ہیں، یہ خادم رسول الثقلین حضرت انس بن مالک کی والدہ ماجدہ تھیں، اسلام کے آغوش رحمت میں آنے سے پہلے آپ کا نام رحیلہ تھا، بعض روایات میں رحیلہ کے بجائے غمیصا اور رمیصا کے نام کا ذکر ملتا ہے، بہرحال ماقبل اسلام آپ کا جو نام بھی رہا ہو اس کی چنداں اہمیت نہیں، اسلام قبول کر لینے کے بعد ام سلیم کے نام سے ہی مشہور ہوئیں۔

ام سلیم مالک بن نضر کے عقد میں تھیں، دل کا آئینہ بے داغ تھا اس لیے نورِ اسلام سے فطری لگاؤ محسوس ہوا تو شوہر کی ہزار مخالفت کے باوجود اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت آپ کی گود میں ایک ننھا سا منا تھا، وہ چاہتی تھیں کہ گہوارۂ طفلی میں رہتے ہوئے ہی اس کے لاشعور میں اللہ کا نام اور اس کی محبت کا نور پیوست ہو جائے، اس لیے وہ کوشش کرتی تھیں کہ اس کی زبان سب سے پہلے جس لفظ سے آشنا ہو وہ 'اللہ' ہو۔ چنانچہ وہ آنکھوں میں ممتا کی تابانی اور دل میں اللہ کی محبت کا نور لیے اپنا چہرہ بچے کے چہرے کے قرب لے جاتیں اور بار بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اللہ اللہ کی صدا بلند کرتے ہوئے اپنے لب کو حرکت دیتیں، کچھ دنوں تک بچہ بھی ماں کی جنبش لب کی نقل کرتے ہوئے اپنے ہونٹ کو زیروزبر کرتا رہا، آخر ایک دن آیا کہ لب کو جنبش دیتے دیتے اس کے معصوم لب پر بھی اللہ کی صدا کھل گئی۔ ام سلیمؓ کے دل کی کلی کھل گئی، بچہ کو گود سے لگا لیا اور اللہ کی تکریم کا شکریہ ادا کیا۔ لیکن شوہر کو یہ بات بڑی ناگوار گذری، وہ ناراض ہو کر گھر سے چلے گئے اور ایسے گئے کہ پھر جیتے جی واپس نہ آئے۔ ملک شام جا کر کہیں بود وباش اختیار کر لی اور وہیں پیوند خاک ہو گئے۔

شوہر کی خبر وفات عام ہوئی تو متعدد نامی گرامی لوگوں کے دلوں میں ان سے شادی کی آرزو انگڑائی لینے لگی۔ پیغامات آنے لگے، ابوطلحہ انصاری نے بھی پیغام بھیجا جو نیک نامی میں مشہور تھے اور معزز بھی تھے، لیکن چونکہ مشرک تھے اس لیے برملا انکار کر دیا، مبادا کسی مشرک کی معیت سے

ان کا نورِ ایمان کثافت زدہ ہو جائے۔ صریح انکار کے بعد بھی ابوطلحہ مایوس نہیں ہوئے، آرزوئے طلب ان کے آستانے پہ جبیں سائی کرتی رہی، ام سلیم نے ان کی وارفتگی دیکھی تو اس وارفتگی کو اسلام سے انھیں قریب لانے کا وسیلہ بنانے کی تدبیر سوچنے لگیں۔ ایک دن ابوطلحہ آئے، کچھ کھوئے کھوئے سے تھے، ناامیدی کے بوجھل قدم سے واپس جانے لگے تو ام سلیم نے کہا: ابوطلحہ ٹھہرو، ابوطلحہ ٹھٹک کر رک گئے، شیفتگی نیاز سے ان کا چہرہ دیکھا اور ادب سے نگاہیں جھکا لیں۔

ام سلیم نے دیکھا کہ پنگھٹ کا راستہ بالکل صاف ہے، آرزو کے پنچھیوں کو وہاں اترنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہ گئی ہے، تو انھوں نے پیار کے نرم لہجے میں، اپنائیت کے بھرپور اظہار وانداز سے ان کے دل کے دروازے کھولنے کی کوشش کی۔ کہا: ابوطلحہ! تمہارے چہرے پہ ہوشمندی کے آثار ہویدا ہیں۔ بہ ظاہر تم بہت حقیقت شناس اور حق بیں وحق آگاہ معلوم ہوتے ہو، پھر آخر اس حماقت کی کیا وجہ ہے کہ تم بے جان پتھروں کو اپنی تقدیر کا مالک سمجھتے ہو، کیا یہ بے جان پتھر تمہیں نفع وضرر پہنچانے کی طاقت رکھتے ہیں، آخر ایک بے جان اور بے حرکت چیز کو تمہاری عقل تمام خدائی قوتوں کا سرچشمہ کیونکر باور کرتی ہے، کیا ان جامد وساکت چیزوں کے آگے سر جھکاتے ہوئے تمہارے انسانی شرف کو عار نہیں آتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں میری محبت حاصل ہو تو عقل وخرد کو رسوا کرنے والی خرافات سے توبہ کر کے حلقہ بگوش اسلام ہو جاؤ، میں تمہیں اپنا محبوب ومطلوب بنا لوں گی اور بغیر کسی مہر کے تم سے شادی کر لوں گی۔ تمہارے قبول اسلام کو ہی میں اپنا مہر سمجھوں گی۔

ابوطلحہؓ کو اب تک ام سلیمؓ کے ذہنی افق کی وسعتوں کا اندازہ نہیں تھا، وہ انھیں صرف ایک شریف خاتون ہی سمجھتے تھے، جس کی خوبروئی ودلربائی ہی ان کے لیے وجہ کشش تھی اور بس۔ لیکن ان کی گفتگو کے دروبست نے نہ صرف ان کی آنکھیں کھول دیں بلکہ ان کی وارفتگی شوق کو بھی اچھال دیا۔ وہ یک لخت تڑپ کے اٹھے اور جذبات کی پوری شدت وتوانائی نے لا الٰہ الا اللہ کی ایسی صدا بلند کی کہ ہوائیں اور فضائیں بھی لا الٰہ الا اللہ کا راگ گنگنانے لگیں۔

حضرت ثابتؓ فرماتے ہیں کہ پوری اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ قیمتی مہر پانے والی خاتون ام سلیمؓ ہیں، ان کا مہر ابوطلحہؓ کا قبول اسلام ہے، بھلا اسلام سے بڑھ کر اعلیٰ وارفع چیز اور کیا ہو سکتی ہے، ام سلیمؓ نے اس مہر کے ذریعہ ان کی تمام نیکیاں اپنے نامۂ اعمال میں مندرج کر لیں۔

آج کی عورتیں شوہر کے انتخاب اور زرِ مہر کی تعیین میں ام سلیمؓ کو اپنا نمونہ بنا لیں تو نیک بختیوں کی افشاں ان کے ماتھے کے ہزار ہزار بوسے لینے لگے۔

ام سلیم سچی مومنہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین مربیہ بھی تھیں، اپنے بچے کی تربیت کے لیے توحید وسنت کو انھوں نے بنیاد بنایا۔ چنانچہ نشو ونما کے ابتدائی مراحل سے گذرنے کے بعد اپنے فرزند کو رسولِ اکرم ﷺ کی تربیت میں دے دیا۔ ذرا اس دینی ہوشمندی پر غور کیجئے کہ جب تک وہ شیر خوار تھا اس کے دل میں اللہ کی محبت کا نور وشعور بھرتی رہیں اور جب وہ کسی قدر باشعور ہوا تو اسے رسول اکرم ﷺ کے مدرسہ میں داخل کردیا۔ اس کی کچھ تفصیل خود حضرت انسؓ کی زبانی سنئے ، وہ فرماتے ہیں کہ

میں دس سال کا تھا، ایک روز ماں نے میرا ہاتھ پکڑا اور ساتھ لے کر چل پڑیں، تھوڑی دیر کے بعد ہم رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اللہ کے رسول نے حال پوچھا تو عرض گذار ہوئیں: اللہ کے رسول ہمارے قبیلے کا ہر شخص آپ کو کچھ نہ کچھ تحفہ اور ہدیہ پیش کرنے کی سعادت سے بہرہ ور ہو چکا ہے، صرف میں باقی ہوں، لیکن میرے پاس اللہ کی بخشی ہوئی ایک دولت صرف یہی لڑکا ہے، مری تمنا ہے کہ بطور ہدیہ آپ میری جانب سے اسے قبول فرمالیں اور اس سے حسب منشا جو خدمت چاہیں، لیں۔

عورتوں کو اپنے بچوں کے مستقبل کی بڑی فکر ہوا کرتی ہے، وہ چاہتی ہیں کہ لڑکا بڑا ہوکر اچھا پیسہ کمائے، لیکن غور کریں کہ ام سلیمؓ نے اپنے بچے کے مستقبل کے لیے جو لائحۂ عمل تجویز کیا، اس سے ان کو کیا ملے گا۔ ایمان ویقین کی دولت، علوم نبوت کی برکت، اللہ کی رضا ورحمت کی جنت۔

ام سلیمؓ کی زندگی کا ایک واقعہ ایسا ہے کہ اگر عورتیں اس کی روح کو سمجھ لیں اور اس کے مطابق اپنی عملی زندگی کو ڈھال لیں تو ان کا گھر جنت کا نمونہ بن جائے، ہر گھر میں کبھی کبھی ایسی باتیں ہوجاتی ہیں جو پریشانی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ عورتیں ایسے موقعوں پر اس قدر بے حال وبے قابو ہوجاتی ہیں کہ شوہر کی مصیبت دوچند ہوجاتی ہے۔ ام سلیمؓ کے گھر میں بھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا، ان کا لڑکا جو بیمار چل رہا تھا اچانک فوت ہوگیا۔ اس وقت شوہر کام پہ گئے ہوئے تھے، انھوں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ اس پر چادر ڈال کر ایک گوشہ میں چارپائی پر لٹا دیا۔ شام کو شوہر واپس آئے تو انھوں نے حسب معمول ان کے ہاتھ پاؤں دھلوائے، کھانا کھلایا اور نماز سے فارغ ہوکر اکٹھا سو رہے، صبح اٹھے، دونوں نے غسل کیا، نماز فجر ادا کی، پھر ناشتہ کرکے جانے لگے تو بچے کا حال پوچھا، کہا کہ اس کی تکلیف بالکل ختم ہوگئی ہے، بڑے سکون سے ہے۔

جب رخصت ہونے لگے تو ام سلیم نے ان کو روکا اور کہا کہ دیکھئے ہمارے ہمسایہ نے کچھ

ادھار لیا تھا، اس سے ادھار مانگا گیا تو جز بز ہونے لگے، شوہر نے کہا یہ تو بڑی نامناسب بات ہوئی۔

تب ام سلیم نے کہا: ہمارے پاس اللہ کی دی ہوئی ایک نعمت لڑکے کی شکل میں تھی، اللہ نے اپنی وہ دی ہوئی نعمت کل واپس لے لی، اس کی آخری رسوم ادا کرلیجئے، تب جایئے۔

جب آخری رسوم ادا ہوچکیں تو ام سلیم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور رات کا واقعہ بتایا۔ رسول اکرم ﷺ نے دعا فرمائی اور کہا اللہ تمہاری راتوں کو بابرکت بنائے۔ اس دعا کی برکت اس طرح ظاہر ہوئی کہ عبابہ بن رفاعہ کہتے ہیں اس دعا کے بعد ان کے سات لڑکے مسجد نبوی میں قرآن پڑھنے آئے۔

ام سلیم کی مجاہدانہ خدمات بھی لائق تحسین ہیں، حضرت ثابتؓ کا بیان ہے کہ جنگ احد کے موقعہ پر میں نے حضرت عائشہ اور ام سلیم کو دیکھا کہ مشکیزہ بھر بھر کر پشت پر رکھتیں اور لا لا کر مجاہدین کو پلاتیں۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ثابتؓ ہی کا بیان ہے کہ جنگ حنین کے موقعہ پر ابوطلحہ نے رسول اکرم ﷺ کی دلبستگی کے لیے ہنسی کے طور پر کہا کہ حضور ذرا ام سلیم کو دیکھئے ہاتھوں میں خنجر لہراتے ہوئے اکڑ رہی ہیں، آپ دیکھ کے مسکرائے، پوچھا: ام سلیم! آخر یہ خنجر کس لیے رکھا ہے؟ عرض کیا: حضور ﷺ! اگر کوئی دشمن میری جانب آیا تو اس سے پہلے کہ وہ وار کرے، میں اسی سے اس کا کام تمام کردوں گی۔ ☆

اعلان نتائج

مسابقۂ حدیث منعقدہ بتاریخ ۲۳ر مئی بروز بدھ ۲۰۱۳ء

پہلی پوزیشن: عبدالرحمٰن طاہر، ششم

دوسری پوزیشن: محمد عدنان، ششم

تیسری پوزیشن: نعمان قطب، پنجم

چوتھی پوزیشن: اسامہ عظیم، ہفتم

پانچویں پوزیشن: ریاض الحق پنجم، محمد طاہر بدرالدجی ہفتم، محمد اکمل حیدر ہفتم، عبدالقوی عادل ہفتم، عبدالرحیم چہارم

چھٹویں پوزیشن: محمد عاصم ہشتم، محمد عارف سردار ششم

ساتویں پوزیشن: عامر جاوید پنجم، متین اشرف ششم، بدرالدجیٰ پنجم، توصیف التمش ہفتم، عبدالمطلب پنجم، محمد انس ہشتم

میں نے اسلام کیوں قبول کیا؟

سیلائن/ ام کلثوم

میں تقریباً تین سال پہلے مسلمان ہوئی، رمضان بعد دونوں عیدوں کا درمیانی زمانہ تھا، اوراس طرح میری تیس سالہ روحانی تلاش مکمل ہوئی، ویسے تو میں ایک کیتھولک خاندان میں پیدا ہوئی، لیکن اپنے اردگرد ایسی بہت سی چیزوں کو میں نے دیکھا جن سے اتفاق نہیں رکھتی تھی۔ مجھے حضرت مسیحؑ پر پورا یقین تھا لیکن اس بات پر نہیں کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں یا وہ بذات خود ہی خدا ہیں۔ میں اپنے طور پر اس نتیجہ پر پہنچی کہ وہ ایک بڑے بزرگ اور عالم تھے کیونکہ وہ ایک تعلیم یافتہ یہودی اور معلم تھے۔ انھیں اسباب کی بنا پر میں نے مطالعہ علماء سے استفادہ کے ذریعہ حقیقت کی تلاش شروع کی اور میری فطرت نے اس عقیدہ کی تصدیق کی کہ مردوں اور عورتوں کا دائرۂ کار الگ الگ ہے یہاں تک کہ عبادت میں بھی انھیں ایک دوسرے سے دوری بنائے رکھنا چاہیے۔

مذہب تو میرے سوالوں کے جواب دینے سے قاصر رہا اور مجھے یہ یقین نہیں ہو رہا تھا کہ خدا مرد ہے، تاہم ایک بات مجھے اچھی لگی کہ خدا کو مجسم نہیں کیا جا سکتا۔ میرے متعلقین میں یوں تو یہودی، عیسائی اور مسلم سبھی تھے لیکن مجھے ان کے مذہب سے کوئی سروکار نہیں تھا، میرا اپنا عقیدہ تھا کہ میرا خدا ایسا ہونا چاہیے کہ میں براہ راست اس سے مکالمہ کرسکوں جب بھی مجھے ضرورت درکار ہو اور اس کی نوازشوں پر اس کا شکریہ ادا کرسکوں، تمام مرد وعورت اور نسلوں میں برابری ہو، عیسائیت نے مجھے حضرت مسیحؑ کے بارے میں بتایا، یہودیت نے بتایا کہ میں براہِ راست خدا سے ہم کلام ہوسکتی ہوں اور مرد وعورت جداگانہ طور پر عبادت کریں، اور موہوک نے سکھایا کہ مرد وعورت میں مساوات ہے اگرچہ ان کا دائرہ کار الگ الگ ہے۔ یہ چیزیں مجھے الگ الگ جگہوں سے ملیں، کسی ایک مذہب میں یہ تمام باتیں میں نے نہیں پائی۔

جب میں ۲۵ سال کی ہوئی تو میری ملاقات ایک عراقی شخص سے ہوئی اور مجھے اس سے محبت ہوگئی، وہ مذہباً یہودی تھا اور کئی سالوں سے اسرائیل میں رہتا تھا، ۱۹۷۰ء میں وہ کناڈا آیا اور ہم دونوں کی ملاقات ہوئی اور محبت ہوگئی۔ اس وقت اسرائیل اور لبنان میں جنگ چھڑی ہوئی تھی، ہماری شادی ہونے والی تھی، لیکن اس نے واپس جانے کا فیصلہ کیا اور فوج میں شامل ہو کر لڑا اور مارا گیا، کئی سالوں تک میں نے اپنے زخم دل کو چھپائے رکھا، لیکن اللہ نے میری دل کی حفاظت کی اور مجھے ایک

عظیم تحفہ عنایت کیا۔ میری ملاقات ایک لبنانی مسلم لڑکی سے ہوئی۔ ویسے تو وہ کچھ زیادہ مذہبی نہیں تھی لیکن اسے مسلمہ ہونے پر فخر تھا۔ ہماری بات چیت ہوئی تو میں نے اس کے سامنے اپنے رازہائے بستہ کھول دئے، اس نے آبدیدہ ہوکر میری طرف دیکھا اور کہا کہ اس نے بھی اسی لڑائی میں اپنے بھائی کو کھویا ہے۔ اس کے بعد ہماری اچھی دوستی ہوگئی اور اس نے میری کافی مدد کی۔

۱۹۹۵ء میں عورتوں کے حجاب کے تعلق سے مسئلہ اٹھا، میں نے اسے حل کرنے کے لیے کئی لوگوں سے انٹرویو لیا کیونکہ مجھے ریڈیو میں کام کرتے ہوئے چار سال ہو چکے تھے، ایک دوست کے ذریعہ میری ایک عراقی خاتون سے ملاقات ہوئی جس نے حجاب کی افادیت واہمیت پر روشنی ڈالی۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کا خدا سے لگاؤ تھا جسے وہ اللہ کہتی تھی۔ میں اس کی سچائی اور نرم دلی سے بہت متاثر ہوئی، اس نے مجھے بتایا کہ اسلام کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ''اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں''۔ مرد وعورت برابر کے حقوق رکھتے ہیں، اللہ کے نزدیک تمام لوگ یکساں ہیں، حضرت مسیحؑ ایک پیغامبر تھے نہ کہ خدا۔ اس نے میرے دل میں گھر کرلیا اور میں اس سے راہ ورسم بڑھانے لگی اور ایک مہینہ کے اندر اندر میں اسی جیسی مسلمہ بن گئی اور کلمہ شہادت پڑھا۔

یہ تین سال پہلے کا واقعہ ہے، اب میں حجاب کا استعمال کرتی ہوں اور خوش ہوں، میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور مذہبی تعلیم حاصل کر رہی ہوں، میرا موضوع اسلام ہے اور ساتھ ہی میں عورتوں کے لیے ایک اچھی وکیل بننا چاہتی ہوں۔ فی الحال انگریزی زبان میں عورت اور ساتویں صدی کے موضوع پر ایک کتاب لکھ رہی ہوں۔ میرا ایک ریڈیو پروگرام شائع ہوتا ہے جس میں اپنے دوستوں کے ساتھ مختلف مذہبی موضوعات پر نشریات کا سلسلہ جاری ہے، اس طرح میں اساتذہ اور علماء کی مدد سے اسلام کی ترجمانی کرتی ہوں، میں کوشش کر رہی ہوں کہ ایک ڈاکومینٹری فلم تیار کروں جس میں مسلم خاتون اور معاشرے میں اس کا کردار واضح کرسکوں، اس لیے میں اپنے قلم اور ریڈیو نشریات کا استعمال کر کے اسلامی تعلیمات کو پیش کرنے کی کوشش کر رہی ہوں، میرا مسلم نام پیارے نبی ﷺ کی صاحبزادی کے نام پر، ام کلثوم ہے، کیونکہ ان کی ذات نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔

یہ ہے میری کہانی، میرا پہلا پیار وہ عراقی یہودی تھا جو جنگ کی نذر ہوگیا، میرا دل ٹوٹ چکا تھا، میں بکھر گئی تھی، ایک لبنانی مسلم خاتون نے ایسے میں میرا ساتھ دیا، لیکن میرے دل کے زخم ایک دوسری عراقی خاتون کے ذریعہ مندمل ہوئے، جس نے مجھے اسلام سے متعارف کرایا اور اسلام قبول کرنے کی دعوت دی۔

اللہ ان تمام لوگوں کو ہدایت عطا کرے جن کا وجود بکھر کر رہ گیا ہے، اسلام کا پیغام امن و امان اور شانتی ہے۔ اللہ پر یقین رکھیں وہ ہمارے لیے بہترین کارساز ہے۔ ☆

سوڈانی مسلم رہنماڈاکٹرحسن ترابی
کے افکاراوران پرہوئے ردِعمل کامطالعہ

☆ذکی الرحمٰن غازی فلاحی

مختصر حالات زندگی:

حسن عبداللہ الترابی (پیدائش: ۱۹۳۲ء) سوڈان کے مشہور ومعروف سیاسی و دینی رہنما ہیں۔ترابی کی پیدائش سوڈان میں ارتیریا کےقریب واقع موضع کسلا میں ہوئی۔ ملک کے شمالی حصے پر شرعی قوانین کے نفاذ میں آپ کا نمایاں کردار رہا ہے۔ترابی کے والدعبداللہ اپنے شہرکے قاضی اورفقہ وشریعت کے ماہر مانے جاتے تھے۔سوڈان کے سابق وزیراعظم ''الصادق المہدی'' کا آپ سے قریبی رشتہ تھا۔۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء کے دوران ترابی نے خرطوم یونیورسٹی کے شعبۂ قانون میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں لندن یونیورسٹی سے ایم۔اے کی سند حاصل کی اور۱۹۶۴ء میں سوربون یونیورسٹی (پیرس) سے ڈاکٹریٹ کیا۔اس کے بعدخرطوم یونیورسٹی میں آپ کاتقررشعبۂ دینیات کے صدرکی حیثیت سے ہوا۔ترابی متعددزبانوں مثلاً عربی،انگریزی،فرنچ اور جرمنی کے ماہر ہیں۔

۱۹۸۸ء میں آپ کوسوڈان کی وزارت خارجہ کا قلمدان سونپا گیا۔ ۱۹۹۶ء میں آپ کو صدارتِ ایوان کا منصب دیا گیا۔دریں اثنا آپ اخوان المسلمون کی سوڈانی شاخ ''میثاق اسلامی فورم'' کے رکن بن گئے تھے۔۱۹۶۴ء میں آپ کواس کا امین عام (جنرل سکریٹری) منتخب کرلیا گیا۔ ۱۹۶۹ء میں صدرنمیری کےفوجی انقلاب کے بعدفورم کے تمام ارکان کونظربند کردیا گیا تھااورترابی نے سات سال قید میں گزارے۔ ۱۹۷۷ء میں صدرنمیری اوراسلامی جماعتوں کے قائدین کے مابین مفاہمتی گفتگوکا آغاز ہواجس کے نتیجہ میں ترابی کوآزادی حاصل ہوگئی۔ نمیری کی حکومت نے ۱۹۸۳ء میں شریعتِ اسلامیہ کی تنفیذ کا اعلان کیالیکن بعدازاں اپنے اعلان کو پورانہ کرتے ہوئے حکومت نے اپنے شریک کار''میثاق اسلامی فورم'' کے خلاف تعزیری اقدامات کرناشروع کردیے۔

☆اسلامی یونیورسٹی، مدینہ منورہ

اس مرتبہ سوڈانی عوام نے حکومت کی من مانی پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔قانونی چارہ جوئیاں مثلاً پارلیمنٹ کی تحلیل اورعوامی مظاہرےعمل میں لائے گئے،حتی کہ ۱۹۸۵ء میں نمیری کے خلاف ایک کامیاب عوامی بغاوت ہوگئی۔اس کے ایک سال بعد ترابی نے''نیشنل اسلامی فرنٹ'' کی بنیادرکھی اورخودکواس کے ذریعہ سے امیدوار پارلیمنٹ نامزدکیالیکن کامیاب نہ ہوسکے۔۱۹۸۱ء میں ترابی کی پارٹی کی قیادت میں صدرمہدی کے خلاف کامیاب فوجی انقلاب برپا کیا گیا جس کے زیراثر صدر مہدی کی پارٹی کی منسوخی،شریعتِ اسلامیہ کی تنفیذ اورعمرحسن البشر کی منصبِ صدارت پرتقرری روبہ عمل آئی۔۱۹۹۱ء میں ترابی نے" مؤتمر شعبي عربي اسلامي " کی بنیادرکھی اوراس کے امین العام مقرر کیے گئے۔اسی دوران ان کوبعض ایشوز جیسے شوریٰ کی بحالی،آزادئ رائے وغیرہ پر حکومتِ وقت سے سخت اختلاف ہوگیا۔۱۹۹۱ء کے اخیر میں صدرالبشیر نے پارلیمنٹ کوتحلیل کردیا، اس کے بعد سے ترابی کی قیدونظربندی کا سلسلہ چل پڑا تا آنکہ مارچ ۲۰۰۴ء میں ان کوفوجی بغاوت کی سازش کے الزام میں باقاعدہ قید کردیا گیا۔ترابی کے متعددفقہی تفردات ہیں جن میں سرفہرست عورتوں کی امامت کا مسئلہ ہے۔

تفہیم فکر ترابی:

حسن ترابی کی اسلامی فکرکا مطالعہ کرنے سے قبل برسرِ موقع ایک اہم بات اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔دراصل حسن ترابی کا شماران مفکرین میں کیا جاتا ہے جن کی فکری ونظری اساسیں مختلف کتابوں میں اس طور بکھری ہوئی ہیں کہ انہیں کسی ایک یا چند تصانیف میں متصور کرنا غلط ہوگا۔حسن ترابی کا شماراُن لکھنے والوں(Prolific Writers) میں کیا جاتا ہے جو بے تکان اپنے تحریری افادات کے مجموعے عام قارئین کے سامنے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ان کی شاید ہی کوئی کتاب ایسی ہوجس میں انہوں نے اپنی بات ڈھائی سوصفحات سے کم میں سموئی ہو۔اس لیے ان کی فکری جولانیوں کی درست تفہیم کی خاطران کے سارے یابیشتر لٹریچر کا غائر مطالعہ ناگزیر قرار پاتا ہے۔اصل مشکل یہاں پیدا ہوتی ہے کہ وہ بالعموم اپنی کسی بات یا نظریہ کوایک یا دوپیراگراف میں ذکرنہیں کرتے ہیں۔اس لیے زیرِنظرمضمون میں قارئین کو باقاعدہ صفحہ نمبر کے ساتھ ان کی کتابوں کے حوالے نہیں مل پائیں گے،البتہ کوشش کی گئی ہے کہ ان کی جملہ تصنیفات اور بالخصوص جو اس موضوع سے متعلق ہیں (تجدیداُصول الفقہ ،تجدیدالفکرالاسلامي، الاشکال الناظمۃ لدولۃ اسلامیۃ معاصرۃ،تجدید الدین، منہجیۃ التشریع) ان کے ناموں کومراجع ومصادر کی فہرست میں الگ سے

ترتیب دے دیا جائے۔

ستر کی دہائی کے اواخر میں حسن ترابی ایک طوفانی وہنگامی حالت سے دوچار ہوئے تھے۔ یوں تو ترابی کی شخصیت اور تنازعات کا باہمی رشتہ مشہور ہے لیکن درپیش صورت حال اب تک کے مقابلے زیادہ سنگین تھی، کیونکہ اس وقت حسن ترابی جلد ہی ایک دراز سیاسی نظر بندی سے آزاد ہوئے تھے۔اس نظر بندی کے پیچھے جو سبب بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سوڈان کے صدر جمہوریہ جعفر نمیری (1969-85) کی حکومت کا تختہ پلٹنے کی کوشش میں حسن ترابی ملوث پائے گئے تھے۔ عالمِ اسلام کی سب سے بڑی اسلامی جماعت "الاخوان المسلمون" کی سوڈانی شاخ "جبهة الميثاق الاسلامی" ۱۹۶۴ء سے ترابی کی متحرک قیادت میں طلبہ وتعلیم یافتہ طبقات کے ذہن ودماغ پر بری طرح حاوی تھی۔ تجارتی یونینس اور مخالف سیاسی محاذ N.F.(National Front) اس تحریک کا مخصوص میدان کار تھے۔ اس وسیع حلقہ اثر سے مہمیز پا کر اس تحریک نے وقت کی فوجی حکومت (1969-77) کے خلاف متعدد بغاوتیں کیں یا ان میں حصہ لیا۔ ۱۹۷۷ء میں نیشنل فرنٹ کے قائدین نے حکومتِ وقت کے ساتھ ایک معاہدہ کرلیا، جس کے بعد حکومت وقت کی طرف سے حسن ترابی کو ملک کی واحد عظیم تر سیاسی پارٹی (Sudani Socialist Union) میں غیر واضح حالات میں ایک اعلیٰ ترین عہدہ پر فائز کر دیا گیا۔

ستر کی دہائی میں حسن ترابی کو درپیش پریشان کن وہنگامہ خیز حالات کا نہ صرف اس پارٹی بلکہ سیاست تک سے کچھ لینا دینا نہ تھا، اس سارے ہنگامے کا تعلق بظاہر ایک معمولی اور مضحکہ خیز سوال سے تھا۔ وہ سوال یہ تھا کہ اگر کسی مشروب میں مکھی گر جائے تو آیا اسے پھینک دینا چاہیے یا مکھی کو مشروب میں مکمل ڈبو کر برضا ورغبت پی لینا چاہیے۔ ثانی الذکر موقف کی تائید وتوثیق اس روایت سے ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے متذکرہ بالا سوال کا یہی جواب دیا تھا، یہ حدیث صحیح بخاریؒ میں منقول ہے("اذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسه ثم لینزعه فان فی احدی جناحیه داء والاخری شفاء" صحیح بخاریؒ: ۳۳۲۰) جو جمہور اہل سنت کے نزدیک احادیثِ رسول ﷺ کا معتبر ترین مجموعہ ہے۔ البتہ فنِ طب اور ادویہ جات کی پیش رفت وترقی نے موجودہ زمانے میں اس حدیث کو محلِ اختلاف بنا دیا ہے۔ کچھ معذرت خواہ (Apologists) مسلم مفکرین نے میڈیکل سائنس کی مدد سے اس حدیث کی صحت وصداقت کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ حضرات اس حدیث کو اسلام کا معجزہ اور اس کی حقانیت کی دلیل قرار دیتے ہیں، کیوں کہ چودہ

صدیوں قبل اس طرح کی معلومات کسی الٰہی وربانی مصدر سے ہی مستفاد ہوسکتی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ حسن ترابی نے اس سلسلے میں اول الذکر موقف اختیار کیا، انھوں نے اس حدیث کو مردود اور سرے سے ناقابل عمل قرار دیا۔ ان کا یہ موقف عوام وخواص دونوں سطح پر مسلم اکثریت کے لیے ناپسندیدہ و ناقابل قبول تھا۔ اپنے اوپر کیے گئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے ترابی نے شریعت کی افادیت وعملیت کے متعلق کچھ میتھوڈ لوجیکل فارمولے (منہجی نماذج) تخلیق کیے جو بقول ان کے روایتی مسلم فقہ کے مسائل ومشکلات کا کامیاب سدِ باب اور اس بابت کسی بھی اصلاح پسند تحریک کو بجا رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔

اولاً انھوں نے بخاریؒ میں موجود تمام احادیث کی صداقت کے مروجہ خیال کو چیلنج کیا، ان کے نزدیک امام بخاریؒ نے احادیث کی چھان پھٹک اور صحت وضعف کے سلسلے میں آخری انسانی حد تک جو کاوشیں اور جانفشانیاں کی ہیں وہ قابل تعریف اور ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں لیکن اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہوسکتے کہ امام بخاریؒ و دیگر جامعینِ احادیث کو معصوم عن الخطا مان لیا جائے اور ان کے مجموعوں کو قرآن کا ہم پلہ قرار دے دیا جائے۔ لہٰذا وہ احادیث جو عقل عامہ (Comman Sense) اور جدید سائنسی حقائق کے صریح خلاف ہوں- جیسا کہ زیر بحث حدیثِ ذباب- ان کو غیر صحیح اور غیر ثابت مان کر رد کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ایسی احادیث کے بارے میں سمجھا جائے گا کہ ان کا سلسلۂ سند جس صحابی سے جا ملتا ہے یقیناً ان کو مدعائے نبوت کے سمجھنے میں غلطی ہوئی اور یہاں اس کا بھی امکان ہے کہ کسی راوی نے مخفی محرکات یا ذاتی مفادات کے تحفظ کے لیے کسی ایسے قول یا واقعہ کو غلط روایت کر دیا ہو۔ حسن ترابی اس مسئلہ میں اس حد تک مبالغہ آرائی کرتے ہیں کہ بقول ان کے، اگر کوئی حدیث اپنے بے عیب اور عدول راویوں اور اختتامِ سند پر موجود صحابی کے واسطہ سے خود رسول اکرم ﷺ سے جا ملے تب بھی اس کی صداقت پر انگلی اٹھائی جاسکتی ہے کیوں کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی دو حیثیتیں تھیں، بشری حیثیت، نبوی حیثیت۔ آپ ﷺ کے کچھ اقوال آپ کی بشریت کا اظہار تھے اور کچھ اقوال آپ ﷺ کے منصبِ نبوت سے مستفاد ہوتے تھے۔ آپ ﷺ کی بشری حیثیت کے ضمن میں وہ تمام اقوال وافعال آجاتے ہیں جو خالصتاً دنیوی معاملات سے متعلق ہیں، یہ اعمال شرعاً واجب الاتباع نہیں ہوتے الا یہ کہ واضح طور پر ان کی مشروعیت ثابت ہوجائے۔ احادیث کے ذخیرہ میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ان معاملات میں مختلف مواقع پر بتقاضائے بشریت غلطیوں کا صدور ہوا ہے۔

جمہور مسلم مکتبِ فکر کے مطابق ترابی کی یہ دینی تشریحات اسلام کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں۔ خیرالقرون سے تااین دم مجددین اور مصلحین امت نے اولین مصادرِ اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت دی ہے اور اولین مصادرِ اسلام سے مراد وحیٔ قرآن، سنتِ رسول ﷺ اور سنت خلفائے راشدینؓ ہی کو سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس ترتیب میں قرآن بلاواسطہ کلام الٰہی ہونے کی وجہ سے اول آتا ہے لیکن سنت کی حیثیت بھی مرکزی ہی ہے کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی صحیح وصریح سنت ہی کی وجہ سے قرآنی آیات اور نبوی اقوال میں باہم امتیاز کیا جاتا رہا تھا۔ اس فہرست میں صحابہ کرامؓ کا کردار بھی فیصلہ کن ہے۔ جمہور المسلمین کے عقیدے کے مطابق تمام صحابہؓ عدول ہوتے ہیں اور انھوں نے احکاماتِ رسول ﷺ کو بے کم وکاست درست سیاق اور واضح الفاظ میں آئندہ نسلوں کو منتقل کیا ہے۔ آخری تجزیے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی تفسیروں اور احادیث کے مجموعوں سے ہی اسلامی نظام زندگی تشکیل پاتا ہے۔ متذکرہ بالاملّی عقائد پر ترابی کی تنقید ایک طرح سے روایتی اسلامی فریم ورک اور مکمل شرعی نظامِ زندگی کو مسمار کردینے کے مرادف بن جاتی ہے۔

قدامت پسند رد عمل :

ترابی کے اس موقف نے سوڈانی تحریکِ اخوان کی صفوں میں اول اول ایک بے چینی پیدا کردی جو بعد میں قیادت سے مکمل بغاوت کی شکل اختیار کرگئی۔ تحریکِ اخوان کے قدامت پسند حلقوں نے ترابی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا تا آنکہ ۱۹۸۰ء میں سوڈانی اخوانی تحریک آئینی لحاظ سے دوحصوں میں تقسیم ہوگئی۔ اس تقسیم کا سہرا ترابی کے سیاسی حریفوں، روایت پرست حلقوں اور سلفی مخالفین کی متحدہ کوششوں کے سر جاتا ہے۔ سیاسی واقعیت پسندی اور فکری ونظریاتی لچک کے علاوہ سوڈان کے صوفی وخانقاہی حلقہ کے تئیں رواداری کے رویہ نے سلفی حضرات کو بھی ترابی کے خلاف صف آرا کردیا تھا۔ سیاسی حریفوں کے نزدیک صدر نمیری کے ساتھ معاہدہ کرنا اور اخوان المسلمون کے مصر میں قائم بین الاقوامی ہیڈکوارٹر میں شرکت واندماج سے گریز وتذبذب برتنا، ترابی کے ناقابل معافی جرم قرار پاتے ہیں۔ اگر چہ یہ مخالف محاذ ترابی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوسکا، لیکن اس نے ترابی کو دفاعی پوزیشن میں ضرور لا کھڑا کیا۔ لہٰذا ترابی اپنی بیشتر دینی تشریحات کو چھپانے یا ان سے تنازل اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور آئندہ اس قسم کے اختلافی مسائل میں اظہارِ رائے کے لیے انھیں محتاط انداز اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا، لیکن مخالفین نے اتنے پر اکتفانہ کیا اور ترابی مخالف یہ مہم جلد ہی ملک سے باہر بھی پہنچ گئی۔

۱۹۸۰ء میں ایک مشہور مصری عالمِ دین نے جن کا شمار اخوان کے قائدین میں ہوتا ہے، ایک استفتا سعودی عرب کی مجلس العلماء کے صدر شیخ عبدالعزیز بن بازؒ کی خدمت میں ارسال کیا۔ اس خط کا خلاصہ یہ تھا کہ حسن ترابی نامی ایک شخص جو سوڈان میں وزارت برائے مذہبی امور یا اسی قسم کے کسی منصب پر متمکن ہے، عجیب وغریب دینی نظریات کا حامل ہے مثلاً حدِ رجم کا انکار، مسلمان عورت کا یہودی وعیسائی مرد سے نکاح کا جواز، یہودی یا عیسائی مذہب قبول کرنے پر حدِ ارتداد کا انکار، شربِ خمر پر حد کے بجائے تعزیر، ماضی کے مسلمہ فقہی اصولوں اور احادیث کی خاص اصطلاحات کو موجودہ دور میں غیر واجب العمل قرار دینا، مرد وزن کے باہمی اختلاط کا جواز وغیرہ وغیرہ۔ مراسلہ نگار نے شیخ بن باز سے درج بالا الزامات کی روشنی میں فتویٰ دینے اور ان خطرناک افکار وخیالات پر قدغن لگانے کی درخواست کی ہے۔

شیخ بن بازؒ نے مذکورہ خط ترابی کو ارسال کرکے ان الزامات کے تئیں ان کی صفائی طلب کی جو ترابی نے دی۔ شیخ بن بازؒ کے نام اپنے خط میں حسن ترابی نے لکھا تھا کہ حدِ رجم کے بارے میں وہ اپنی ایسی کوئی رائے نہیں رکھتے ہیں، البتہ ہوا یہ تھا کہ وہ ایک چھوٹے سے علمی حلقے میں جید مصری عالم شیخ ابوزہرہؒ کی متعلقہ مسئلہ پر رائے پر تبادلۂ خیال کررہے تھے، جس کو غلط انداز میں روایت کردیا گیا ہے۔ زواج مسلمہ بغیر المسلم کے مسئلہ پر انھوں نے کہا کہ وہ صرف ان امریکی مسلمان عورتوں کے بارے میں یہ موقف رکھتے ہیں جو خود تو حلقہ بگوش اسلام ہوگئی ہیں لیکن ان کے شوہر ابھی حالت کفر ہی میں ہیں۔ حالتِ ارتداد سے متعلق تفصیل میں جائے بغیر انھوں نے چند قدیم فقہاء کی آراء ذکر کی ہیں، جن کی رو سے حدارتداد کا محملِ تطبیق صرف اور صرف مسلم حکومتِ وقت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا ہے۔ حدِ خمر کے متعلق انھوں نے کہا کہ صدر نمیری کے دورِ اول میں جب معاشرے کی اسلامی خطوط پر تنظیم نو کے منصوبے پر بحث کی جارہی تھی، اس دوران ملکی قانون پر نظر ثانی کرنے والی کمیٹی (Law Revision Committee) کے ممبران میں خمر کے مسئلہ پر اختلاف رائے ہوگیا تھا۔ یہ کمیٹی شراب کی ممانعت پر تو یک لفظ تھی لیکن حدِ خمر پر اس میں اتفاقِ رائے نہیں ہو پارہا تھا، اس وقت میں (ترابی) نے شراب کی ممنوعیت کو قانونی درجہ بخشنے کے لیے زیر بحث رائے کا اظہار کیا تھا اور میرا مقصود قانون ساز کمیٹی کو کسی صورت میں ممانعتِ خمر پر راضی کرلینا تھا۔

اصولِ فقہ کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ اصول فقہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول: وہ جو صریح اسلامی احکامات پر مبنی یا ان سے مستفاد اور مشتق ہیں، دوم: وہ جو متأخرین فقہاء کے وضع کردہ ہیں۔

اول الذکر واجب الاتباع ہیں جب کہ ثانی الذکر کی یہ حیثیت نہیں ہے۔ جنسی اختلاط کے متعلق انھوں نے کہا کہ عہدِ نبوی میں عورتیں معاشرتی سرگرمیوں سے الگ تھلگ نہیں تھیں لیکن موجودہ مسلمان معاشروں میں حال یہ ہوگیا ہے کہ صنف نازک کو گھروں کی چہار دیواری میں نظر بند رکھنے اور اجتماعی زندگی سے منقطع کردینے کو مناسب مذہبی تعلیم وتربیت کا بدل خیال کیا جاتا ہے جو غلط ہے اور نہایت درجہ غلط ہے۔ اپنے مفصل جوابی خط کے خاتمے پر ترابی نے اس بات کا شکوہ کیا ہے کہ ان کو مصر کی اخوان المسلمون کے قائدین کی طرف سے چلائی جارہی الزام تراشی اور بدنامی کی سیاسی مہم کا نشانہ بنایا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ منحرف یا الحادی نظریات کا وجود جدید مسلم فکر کا اصل مسئلہ نہیں ہے، بلکہ اصل مرض یہ ہے کہ امت مسلمہ آج اسلام کو بکمال وتمام ماننے سے عملاً سرتابی کیے ہوئے ہے۔ رجوع الی الاسلام کی تجدیدی دعوتوں وتحریکوں کے لیے اس پورے منظر نامے کو ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے اور اصلاح وتربیت کے عبوری مراحل کے لیے انھیں متعدد تنازلات اور مصالحات اختیار کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنا ہوگا۔

خط میں نمایاں اس مفاہمتی اور مصالحتی انداز کے علی الرغم ترابی کے نظریات وافکار کے خلاف قدامت پسند حلقوں کی مہم جاری رہی۔ اسّی کی دہائی کے اوائل میں ایک گمنام عالم دین ''ابن مالک'' نے ایک کتاب بنام "الصارم المسلول في الرد على الترابي شاتم الرسول" (The Unsheathed Sword in reply to Turabi The Abuser of Prophet) شائع کی۔ کتاب میں ترابی کے اس لیکچر کو لفظ بہ لفظ نقل کیا گیا ہے جس میں انھوں نے حدیث کے متعلق اپنے افکار پیش کیے تھے اور شدید ترین الفاظ میں ان افکار کا رد کرتے ہوئے ان میں مضمر کفریات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ 1983-85 میں نمیری حکومت کے دورِ اقتدار میں اسلام کی تشکیل نو کے پروگرام نے اس ترابی مخالف مہم کو مزید ہوا دی تھی اور پھر 1986-89 میں ملکی سیاست کے جمہوری دور میں ان الزامات اور اعتراضات کو کھلم کھلا پھیلایا جاتا رہا تھا۔ اسلامائزیشن کے مباحثہ میں ترابی کی شرکت اور بیانات نے اس آگ میں تیل بلکہ بارود ڈالنے کا کام کیا اور اندرون وبیرونِ سوڈان یہ موضوع عوام الناس کی توجہ اور گفتگو کا مرکز بن گیا۔

نظریے کی تعبیر نو:

روایتی اسلامی مفکرین کے بنسبت آزاد خیال اور اصلاح پسند نظریات کے حامل متجدد مفکرین پر ترابی کے افکار کا اثر زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ ترابی کے افکار وخیالات بیک وقت

جہاں ایک طرف روایتی اسلام کی تنظیم وتجدید نو پر مصر، آزاد خیال وبنیاد پرست ناقدین (Liberl Critique of Fundamantalists) کا مرکز توجہ بنے ہیں، وہیں فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید کے حامی معذرت پسند مسلم مفکرین نے بھی ان کو اپنی تحریکی ودعوتی سرگرمیوں کا نقطۂ آغاز بنایا ہے۔ چونکہ قدرتی طور سے ملکی وعالمی سیاسی حالات کے تحت ترابی کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی تھی، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بنیاد پرست تحریک کے لیڈر کی حیثیت رکھنے کے باوصف، قدرے لبرل اور متوسع افکار ونظریات کے حامل تھے۔

۱۹۸۸ء میں وزارتِ عدل اور جنرل اٹارنی کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ترابی نے اسلامی نظامِ قضا وفوجداری پر اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کیا۔ عورت کے حقوق اور مسلم معاشرے میں غیر مسلموں کی شرعی حیثیت اس زمانے میں ان کے پسندیدہ موضوعات تھے۔ جون ۱۹۸۸ء میں ایک ٹی وی مباحثہ کے دوران اُن کے افکار ونظریات کو علی الاعلان چیلنج کیا گیا، اس مباحثہ میں ان کے اس نظریہ کو رد کیا گیا تھا جس کی رو سے عصرِ حاضر کے مسلم اقلیتی ممالک میں نفاذِ شریعت یا اقامتِ دین کی کوششیں کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ اسلامی حکومت میں عورت اور غیر مسلم کو اعلیٰ ترین منصب کی اہلیت ولیاقت کا حامل بتانے والے اُن کے نظریات کو بھی زیر بحث لایا گیا۔ ترابی کے نزدیک اس میں کوئی قباحت نہیں، کیوں کہ اُن کے نزدیک مسلم اور غیر مسلم اقوام کے باہمی تعلقات سرتاسر طرفین کی جانب سے باندھے گئے معاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس قسم کے معاہدوں میں مندرج ومقرر اشیاء کو شرعی اعتبار حاصل ہوجاتا ہے خواہ ان کی نوعیت کچھ بھی ہو۔ اُن کا کہنا ہے کہ یہ واقعیت پسندانہ موقف اسلام کی روح اور اولین مسلم معاشرے (عہدِ رسول ﷺ وصحابہ) سے ہم آہنگ ہے۔ ترابی نے قتالِ کفار کے جمہور المسلمین کے نظریے کو بھی ہدفِ تنقید بنایا ہے، ان کا استدلال ہے کہ قدیم انسانی دنیا کی عالمی صورتِ حالات اس قسم کے احکامات کی متقاضی تھیں، لیکن عصر حاضر میں متفق علیہ بین الاقوامی قوانینِ امن وسلامتی کی موجودگی میں اب جہاد وقتال کے شرعی سمجھے جانے والے احکامات کی ضرورت چنداں باقی نہیں رہی ہے۔

روایت پسند دینی حلقوں سے ترابی کے ان نظریات پر شدید ردعمل سامنے آیا۔ مثال کے طور پر مصر کے روزنامہ ''الایام'' ۳۰ رجون ۱۹۸۸ء میں شائع شدہ عبداللہ فضل اللہ عبداللہ کا مضمون ملاحظہ کیا جائے۔ مضمون نگار نے ترابی کو شریعت کی واضح تعلیمات کی مخالفت اور بے اصل اور گمراہ کن نظریات پھیلانے کا ملزم ٹھہرایا ہے۔ مضمون نگار کا کہنا ہے کہ عورت کے منصف اور حاکم بننے پر

بعض قدیم اسلامی مکاتب فکر کی تائید کا ترابی کا دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے۔ ترابی کے اس دعوے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بڑے فقہی مذاہب میں سے کوئی اس کا قائل ہے، درآں حالانکہ یہ بعض شاذ اور گمنام آراء ہیں، جن کا کبار مذاہب اربعہ سے کوئی واسطہ نہیں، اور انہی شذوذی اقوال پر ترابی نے اپنے اس نظریہ کی اساس رکھی ہے۔ عصرِ حاضر میں جہاد بالسیف کی منسوخیت کا ترابی کا دعویٰ تمام ائمہ اسلام کے اجماع کے منافی ہے۔ فقہائے اسلام کے مابین کفار سے بلا مداہنت جنگ کرنے پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے۔ فقہِ اسلامی کا یہ قاعدہ سوڈان کے غیر مسلم قبائل پر بھی صادق آتا تھا جن کو ترابی بہر صورت اسلامی مملکت کا ایک جز بنانے پر مصر ہیں۔

اسی طرح ترابی کا یہ نظریہ کہ غیر مسلم افراد نے ماضی میں اسلامی مملکت کے اعلیٰ ترین مناصب حاصل کیے تھے، قدامت پسند اور آزاد خیال دونوں قسم کے مسلم مفکرین کے نزدیک غیر مستند و غیر مدلل ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریروں میں اس بات کی مفصل وضاحت کی ہے کہ اسلامی مملکت میں کوئی غیر مسلم کلیدی عہدوں کا اہل نہیں مانا گیا ہے، اور نہ ہی انتخابِ خلیفہ کے لیے کبھی غیر مسلموں سے استصواب رائے کیا گیا ہے، لہٰذا اسلامی مملکت میں مسلم و کافر میں مساواتِ حقوق کا ترابی کا نظریہ ناقابل قبول ہو جاتا ہے۔ ۱۹۸۸ء کے اخیر اخیر میں سوڈان کی مجلسِ قانون ساز کے سامنے نئے مسودۂ قوانینِ اسلامیہ کے تئیں ترابی کے حلف برائے وفاداری نے دوبارہ اعتراضات کا منہ کھول دیا تھا۔ ناقدین کے نزدیک یہ مسودۂ قوانین، شرعی ہدایات و تشریحات کے بجائے لادینی اصولوں پر تیار کیا گیا تھا، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی رو سے آئینی طور پر اسلامی مملکت میں مسلم و غیر مسلم کو مساوی حقوق کا اہل قرار دیا گیا ہے۔

ترابی نے اپنے ان نظریات کی تائید میں آیت کریمہ: ﴿فَإِن جَآؤُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُم أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ وَإِن تُعْرِضْ عَنْهُمْ فَلَن يَضُرُّوكَ شَيْئاً وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ﴾ [المائدۃ:۴۲] سے استدلال کیا تھا۔ اس آیتِ کریمہ میں اللہ کے رسول کو غیر مسلموں کے معاملات میں فیصل بننے اور نہ بننے کا اختیار دیا گیا تھا، لیکن واضح رہے کہ جمہور اعلام مفسرین کے نزدیک آیت کی یہ 'ترابیانہ' تشریح غلط ہے۔ ان کے نزدیک یہ آیت کریمہ اپنی مابعد آیات میں مذکورہ شرائط کی روشنی میں منسوخ مانی گئی ہے۔ ﴿وَأَنِ احْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّهُ وَلاَ تَتَّبِعْ أَهْوَاءهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَن يَفْتِنُوكَ عَن بَعْضِ مَا أَنزَلَ اللّهُ إِلَيْكَ﴾ [المائدۃ:۴۸] اسی طرح ترابی نے اپنے استدلال کی خاطر مدینہ منورہ میں

تشکیل پانے والی اولین اسلامی ریاست کو ایک اتحادی مملکت (Federal State) سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی بقولِ ترابی، اس میں یہودِ مدینہ اور مسلمانوں کی مساوی حیثیت تسلیم کی گئی تھی، حالانکہ ترابی کا یہ استدلال بھی غلط ہے۔ کیوں کہ تمام مؤرخین اور سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ ہجرتِ رسول ﷺ کے معاً بعد کیے جانے والے مدینہ منورہ کے اولین انتظامات کی نوعیت ایک معاہدے کی تھی، کسی ریاست کی تشکیل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا اور حقیقتِ واقعہ بھی یہی ہے کہ اس معاہدے کی رو سے یہودِ مدینہ کو مسلمانوں پر کسی قسم کی قانونی بالادستی نہیں دی گئی تھی۔

مخصوص نظریات و افکار کے پہلو بہ پہلو ترابی نے اپنی کتاب ''تجدید الفکر الاسلامی'' میں تجدید و احیائے اسلام کے عملی طریقوں (Methodological Proposels) کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے۔ لیکن شامتِ اعمال کہ ان کے اس تجدیدی منصوبے نے بھی روایت پسند دینی حلقوں میں ان کے خلاف غم و غصہ میں اضافہ ہی کیا ہے۔ اس ہنگامہ خیزی میں ابھی کچھ کمی نہیں آئی تھی کہ ترابی نے ایک اور نیا نظریہ یہ پیش کر دیا کہ قرآنِ کریم کی جملہ قدیم تفاسیر اپنے اپنے عہد اور معاشرے کی روح کی عکاس اور حالات کی ترجمان رہی ہیں، اور اب قرآن کو دوبارہ از سرِ نو تفسیر و تدبر کا موضوع بنانے کی ضرورت ہے۔ جمہور علماءِ دین نے ان کے اس نظریہ کو کافرانہ قرار دیا، ان کا کہنا تھا کہ ایسے کسی بھی گمراہ کن نظریہ کو مان لینے کا سیدھا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کے لازوال تشریعی سرچشمہ کو حالات و تغیرات کے تابع قرار دے دیا جائے۔

ترابی کے ایک اور دعوے نے بھی جدید مسلم فکر کو بیحد متأثر کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اسلام جو ایک کائناتی و آفاقی دین ہے، کبھی اپنی کامل صورت میں روئے زمین پر زیرِ عمل و زیرِ نفاذ نہیں آسکتا ہے، بلکہ ہوگا یہ کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں ہمہ وقتی و ہمہ جہتی ترقی و ارتقا ہوتا رہے گا۔ ناقدین نے اس کو اسلام کی تعبیرِ نو کے بجائے ایک نئے دین کی تاسیس کے ہم معنی قرار دیا۔ اس نظریہ کی رو سے اسلام کا اولین عہد کسی لحاظ سے اسوہ اور قابل اتباع نہیں رہ جاتا۔ یہ نظریہ جمہور مسلمین کے اس عقیدے کی بھی نفی کرتا ہے، جس کی رو سے مستقبل کی تمام مسلم نسلوں کے لیے اولین اسلامی معاشرہ رول ماڈل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترابی نے اپنی کتاب میں اس اصلاحی منصوبے کو ''تطویر الدین'' یعنی دین کے ارتقاء و ترقی سے تعبیر کیا ہے اور اس کو تجدیدِ دین یعنی دین کے احیائے نو سے ممیّز دکھایا ہے۔ ترابی کے نزدیک تجدیدِ دین کا مطلب ہے ماضی کے طریقہ ہائے فکر و عمل کا احیاء کرنا، جب کہ تطویرِ دین کا مطلب دین کو نئے مراحلِ حیات سے ہم رنگ و ہم آہنگ بنانا ہے۔ اس

قسم کی نارواتشریحات سے ہمیں کسی حد تک ترابی کے تخریبی عزائم سے آگاہی ہوجاتی ہے۔ترابی کا اصرار ہے کہ مذہب کے ابدی اصولوں کو حقائقِ زندگی کے تابع اور اس سے سازگار بنانا ضروری ہے، نہ یہ کہ اس کے برعکس حقائقِ زندگی کو اصلاح وتہذیب کے ذریعہ موافقِ مذہب بنالیا جائے۔

عورت اور غیر مسلموں سے متعلق منحرف افکار ونظریات کی ترویج واشاعت اور ظہورِ مہدی یا نزولِ عیسیٰؑ سے متعلق صحیح احادیث واخبار کی تنقید وتردید کے ذریعہ ترابی اپنے تصورِ ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔ان کے نزدیک مستقبل قریب یا بعید میں اگر فیشن اور ضروریاتِ حیات مزید آزادیٔ نسواں کی داعی ہوجائیں تو قرآن وحدیث کے واضح احکامات کو برطرف کرکے ہمیں ترقی کا ساتھ دینا پڑے گا۔اسی طرح اگر غیر مسلم حضرات کو صدر مملکتِ اسلامیہ کے مناصب تفویض کرنے کا چلن ہوجائے تو ہمیں مذہب کو تراش خراش کر اس سیاسی مظہرہ کے موافق بنانا ہوگا اور اگر جہاد فی سبیل اللہ کو بتقاضائے عصرِ حاضر منسوخ مان لیا جائے تو اس مقدس فریضے کو بھی تاقیامت متروک قرار دے دینا پڑے گا۔

ترابی نے اپنی تحریروں میں متعدد مقامات پر مذہب کے ناقابلِ تغیر وتبدل ابدی اصول واقدار اور ان کے بالمقابل حالات وضروریات کے تحت متغیر ہونے والے ان کے مخصوص استعمالات وطریقہ ہائے اظہار کے مابین فرق بیان کرنے کی جو ناکام کوشش کی ہے وہ بذاتِ خود باعث فکر وتشویش ہے۔ترابی کے اس فکری واہمہ کو قبول کر لینے کے بعد، بیشتر لادینی والحادی مفکرین کا یہ عقیدہ کہ کسی بھی دین کی ظاہری اشکال وہیئتیں وقت وحالات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اپنے اندر کوئی نکارت رکھتا نظر نہیں آتا۔ترابی اسی پر اکتفاء نہ کرتے ہوئے ہر علاقے اور ہر قوم کو اپنے مناسبِ حال طریقہ ہائے عبادت اختیار کرنے کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔وہ بدلتے حالات میں روایتی عقائد واعمال کی بتدریج اصلاح وتجدید کے رویے کی مذمت کرتے ہوئے قدیم روایتی ڈھانچے کو پوری جرأت مندی اور انتہا پسندی کے ساتھ مسمار کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ان کی نظر میں ماضی کے ورثہ کو حرزِ جاں بنانے والے تنگ نظر، متحجر (Rigid) مزاج اور بزدل ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔وہ اسلاف کے تاریخی ورثہ کو نظر انداز کرتے ہوئے براہ راست شریعت کے اصل مصادر سے استفادہ کی دعوت دیتے ہیں۔ان کے نزدیک سلفِ صالحین کی علمی میراث کسی طور پر فیصلہ کن نہیں، کیوں کہ یہ ان کے مخصوص حالات وظروف کا انعکاس بھر ہے۔شاید یہی کچھ ایک عام قاری کی طرف سے حسن ترابی کی ان بے سروپا تشریحات کے رد میں بھی کہا جاسکتا ہے، یعنی یہ لغو

مباحث وافکار محض ترابی کے مخصوص حالات وکوائف کا انعکاس بھر ہیں۔

ترابی کے اصلاح وترقیٔ دین کے منصوبے وعملی طریقۂ کار کی تخریب پسندی وہلاکت خیزی سے متعلق جو رہے سہے شکوک وشبہات تھے وہ اس منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے بعد یقین ومسلمات میں بدل گئے۔ترابی کا صنفِ نازک کو آزادانہ اختلاط کی دعوت دینا اور حکومتی اداروں میں اعلیٰ مناصب پر خواتین کی تقرری کی وکالت کرنا صریح شرعی احکامات کے خلاف ہے۔شریعت صنف نازک کے لیے گھر کی چہار دیواری کو ہی میدانِ عمل قرار دیتی ہے اور صرف انتہائی مجبوری میں کامل علیحدگیٔ زن ومرد جیسی شرائط کے ساتھ اس کو زندگی کی گھما گھمیوں سے نبرد آزما ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ترابی آزادیٔ نسواں کے اپنے مفروضے کو صحیح قرار دیتے ہوئے ابتدائے اسلام سے آج تک چلے آرہے علمائے اسلام کے اجماع کو غلط قرار دیتے ہیں۔ان کی عظیم الشان دلیل کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ آزادیٔ نسواں کا نظریہ بہر حال دنیا میں غالب ہورہا ہے اور غالب ہوکر رہے گا، تو کیوں نہ اسلامی شریعت کو اس کے موافق ڈھال لیا جائے۔بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ترابی کے نزدیک امتِ مسلمہ کا قدیم معاشرتی واجتماعی نظامِ زندگی کچھ اس قدر لاچار ومجبور نظر آتا ہے کہ وہ خود اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا۔

آزاد خیال ردِ عمل :

ترابی کی نظریاتی جنگ دوطرفہ رہی ہے، ایک طرف انھوں نے روایت پسند دینی حلقوں سے پیکار لی ہوئی ہے، دوسری طرف وہ آزاد خیال مفکرین کے بھی معتوب بنے ہیں۔70ء کی دہائی میں صرف ایک مختصر مدت کے لیے سوڈانی اخوانی تحریک نے ملک کے جمہوری ڈھانچے سے اتفاق کرکے اپنے آپ کو سیاسی حلقوں میں مقبول بنایا تھا، لیکن اس مختصر عرصہ سے ماقبل و مابعد سوڈانی تحریکِ اخوان اور اس کی قیادت بیشتر اوقات ملکی سیاسی جماعتوں کا ہدفِ تنقید وملامت ہی بنی رہی ہے۔صدر نمیری کی عوامی نامقبولیت کے آخری زمانہ میں تحریکِ اخوان کا ان کی معاونت کرنے اور اسلامائزیشن کے ان کے متنازع فیہ منصوبے پر رضامندی کا رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے بھی اس مخالفت کو بڑھاوا ملا تھا۔نمیری دور کے سابق وزیرِ خارجہ منصور خالد نے اس دور سے متعلق اپنی یادداشتوں میں جو بعد میں مستقل کتاب کی حیثیت سے شائع ہوگئیں (الفجر الکاذب: نمیری وتحریف الشریعۃ: الدکتور منصور خالد) اس عہد کا تاریخی تجزیہ کیا ہے۔اس تجزیہ میں انہوں نے ترابی اور ان کے ہم نواؤں کا نمیری اصلاحات کی تائید وتوثیق کے خاطر کھل کر سامنے آنے کے رویے پر بڑا شدید

اظہارِ خیال کیا ہے۔ وہ ان نمیری اصلاحات کو تہذیبِ اسلامی کی صبحِ نو کے کہرے میں چھپی بربریت اور مذہبی انتہاء پسندی کی دلدل کا نام دیتے ہیں۔

وزیرِ موصوف ترابی کے اس فکری نقطہ پر کامل اتفاق کا اظہار کرتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں روایتی اسلامی فکر کو بدلنا ہوگا اور قدیم اسلامی اقدار و روایات کو عہدِ حاضر سے ہم آہنگ قالب میں ڈھالنا ہوگا۔ ترابی سے ان کی وجہ نزاع یہ ہے کہ ترابی نے نہ صرف عملی زندگی میں اپنے نظریات کو استعمال نہیں کیا، بلکہ بسا اوقات اپنے سابقہ آزاد افکار و خیالات سے یک گونہ معکوس راہِ عمل اختیار کرلی۔ مثلاً ۱۹۸۸ء میں - بقول ان کے - ترابی نے اسلامی آئین کو ملک میں نافذ قوانین کا مجموعہ قرار دیا تھا حالانکہ اس فیصلہ کا عام افراد کی متفقہ آراء سے کوئی تال میل نہیں تھا۔ ترابی نے اپنی متعدد علمی تصنیفات میں مذہبی اجارہ داری اور جابرانہ طرزِ حکومت کی سخت مذمت کرتے ہوئے عوام الناس کے انفرادی و اجتماعی حقوق دہی کی وکالت کی ہے۔ اپنے اس فکری عقیدے کی پاسداری میں ترابی نے عملاً ایسا کیا بھی۔ ۱۹۷۷ء میں ترابی نے سوڈانی قوانین پر نظرِ ثانی کے لیے نمیری کی قائم کردہ کمیٹی میں شرکت کرتے ہوئے قانونی اصلاحات کے نفاذ کے لیے محتاط رویہ اختیار کرنے کی تاکید کی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ اس وقت کے حالات میں فوری و یکسر قانونی تبدیلیاں اور ان کے کلی نفاذ و تطبیق کے نتیجے میں موجودہ معاشرتی نظام درہم برہم بھی ہوسکتا ہے اور اس طرح پورا ملک انارکی و بدامنی اور انتشار و فوضویت کا شکار ہوسکتا ہے۔ لیکن ستمبر ۱۹۸۳ء میں جب صدر نمیری نے جملہ قانونی اصلاحات کے فوری نفاذ کا اعلان کردیا، تو ترابی نے اپنے تمام سابقہ بیانات و مواقف سے یکسر طوطا چشمی کرتے ہوئے صدر نمیری کی جابرانہ حکومت کا ساتھ دیا اور بتدریج اصلاح، امن اور انصاف جیسے ایشوز کو کاغذی مذاق قرار دیا۔

خالد منصور مزید کہتے ہیں کہ مرد و زن اور مسلم و غیر مسلم کے مساوی حقوق کے بارے میں ترابی اور ان کے متبعین نے یا تو غلط طور پر اسلامی فقہ کو اپنا ماخذ بنایا ہے، یا پھر بعض خود تراشیدہ و نام نہاد شرعی قوانین میں ان کی حفاظت و ضمانت کا دعویٰ کیا ہے، حالانکہ خود ان کے بنائے و نافذ کردہ مجموعۂ قوانین میں ایسی دفعات پائی جاتی رہی ہیں، جو ان کے اس کھوکھلے دعوے کی نفی کرتی ہیں۔ ترابی نے پہلے مرحلے ہی میں اس بات کا کامل ادراک کرلیا تھا کہ ستمبر ۱۹۸۳ء میں جبراً نافذ کردہ مجموعۂ قوانین کی بدولت، ۱۹۷۳ء میں تیار و نفاذ شدہ دستور کی دفعہ ۳۸ کی معنویت بری طرح مسخ ہو رہی ہے۔ سابقہ دستور کی اس دفعہ کے بموجب تمام اہلِ وطن کو مساوی حقوق کی ضمانت دی گئی تھی۔ اتنا

سب ہونے کے بعد ترابی اور ان کے متبعین سے امید تھی کہ عام شہری و وطنی حقوق کی اس پامالی پر شد و مد کے ساتھ نکیر کریں گے، لیکن جو ہوا وہ ان توقعات کے برعکس تھا۔ انھوں نے خود ساختہ و متوہمہ لاقانونیت و انارکی کے خطرے سے اجتناب کا بہانہ کرتے ہوئے ۱۹۸۴ء میں اسپیکر آف پارلیمنٹ کے منصب سے نمیری کی نام نہاد قانونی اصلاحات کے نفاذ کی باصرار استدعا و تائید کی۔

خالد منصور کے نزدیک صدر نمیری کی نام نہاد قانونی اصلاحات اور دستوری ترمیمات کی تائید میں ترابی کے متبعین اسلام پسندوں نے انتہائی فکری و اخلاقی دیوالیہ پن کا مظاہرہ کیا تھا۔ ایک طرف تو انھوں نے اسلام کی آفاقی اقدار اور گزشتہ صدیوں کے روایتی و معاشرتی نظاموں میں ان اقدار کے تاریخی اظہار کے مابین فرق کا ڈھنڈھورا پیٹا تھا اور عام فقہائے دین کو اسلام کی تعبیر نو کا مزاحم و مخالف اور دقیانوسیت و روایت پرستی کا مجرم قرار دیا تھا، لیکن دوسری طرف انھوں نے 1983-85 میں نمیری قانونی اصلاحات کے مخمصے میں پھنس کر اپنے طرزِ عمل سے خود اپنے دعوے کی پول کھول دی۔ اس پورے پرآشوب عرصے میں اسلامی اقدار و روایات کو ان کے قطعی، تاریخی و لغوی سیاق سے کاٹ کر مسخ کرنے کی اُن کی شرمسار کوششوں کا حال آج سب کو معلوم ہو چکا ہے۔

ان کے اس منافقانہ طرزِ عمل کی کھلی دلیل ۱۹۸۳ء کا خود ساختہ قانونِ تعزیرات ہے جس میں سابق سیکولر دستور کی ۴۵۰ دفعات میں سے صرف ۱۰ دفعات میں معمولی تبدیلیاں کی گئی تھیں۔ قانونِ تعزیرات میں کی گئیں اسلامی اصلاحات کا خلاصہ بھی صرف یہ تھا کہ متعلقہ موجبِ حدودِ شرعیہ جرائم کو ذکر کیے بغیر حدود شریعت کو نافذ العمل کیا جائے، بالفاظ دیگر چند مخصوص مذہبی حدود کو تمام دنیوی جرائم پر عام کردیا گیا تھا۔ اس وقت ترابی کے متبعین اسلام پسندوں نے ان دستوری اصلاحات پر خوب بغلیں بجائیں تھیں اور اس تنفیذ کو فقہی اجارہ داری کے خاتمے اور تہذیبِ نو کی صبح درخشاں جیسے القاب سے موسوم کیا تھا۔ ان شرعی و تعزیری تحریفات و انحرافات کے دفاع میں ترابی بذاتِ خود صفِ اول میں نظر آئے تھے اور انہوں نے ۱۹۸۴ء میں قائم شدہ ایمرجنسی کورٹ کے روبرو شریعتِ اسلامی میں برپا کی گئی اس کتر و بیونت کو اسلامی کاز کی ضرورت قرار دیا تھا۔ ترابی نے ان اقدامات کو جرأت مندانہ گردانتے ہوئے مانا تھا کہ سوڈان کا یہ نفاذِ شریعت کا اقدام جدید دور کی اسلامی دنیا کے لیے سوڈان کی علمی و قانونی سوغات قرار دیا جاسکتا ہے۔

۲۵ ستمبر ۱۹۸۴ء میں منعقدہ ایک کانفرنس میں ترابی نے دورانِ خطاب کہا تھا کہ اسلام کا محمدی ماڈل بشمول لفظی و عملی ماخذ ایک آفاقی و ابدی معیار ہے، لیکن ان معیاری اقدار کا اظہار مختلف

حالات وکوائف میں مختلف شکلوں اور پیرایوں میں ہوتا آیا ہے اورعقلاً ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگرانھوں نے 85-1983 کے اپنے طرزِعمل سے اس قول کوجھٹلا دیا۔قانونی اصلاحات کے نام پرانھوں نے تمام شرعی اداروں اوراحکامات کوان کے تاریخی ولغوی سیاق سے کاٹ کران کی معنویت و اہمیت کو بے پناہ نقصان پہنچایا ہے۔لہٰذا اُن کی تراشیدہ واجب العمل قانونی اصلاحات وترمیمات بالآخرنام نہاد اسلام پسندی، مسخ شدہ جمہوریت اور جابرانہ طرزِحکومت کا ایسا عجیب وغریب ملغوبہ بن گئیں، جس کا اولین سائڈ افیکٹ یا جانبی نقصان یہ ہوا کہ روحِ جمہوریت سے خالی اور تکریمِ بنی نوعِ انسانی کے جذبے سے عاری بعض اعمال وتصرفات کی زبردستی دینِ فطرت میں پیوندکاری کردی گئی اوراس پیوند لگے عملی نمونہ کواسلامی رول ماڈل کی حیثیت سے روشناس کرایا جانے لگا۔

ترابی نے ڈیموکریسی کے اسلامی متبادل کی حیثیت سے اولین مدنی معاشرے کے چند پہلوؤں اورسوڈان کی مہدوی تحریک کے نظامِ حکومت کو جزوی طور پر پیش کیا ہے۔اس میں بھی انھوں نے اپنی عادت کے مطابق ان واقعات کے تاریخی سیاق کوحذف کرنے کی جسارت کی ہے۔ ترابی اوران کے ہم نوا مؤیدین غالباًعلم سیاسیات کی اس بدیہی حقیقت کوفراموش کر بیٹھے ہیں کہ ماڈرن ڈیموکریسی (جدید جمہوریت) کا مجموعی ڈھانچہ مسؤلیتِ حاکم کے مفروضے پرقائم ہوتا ہےاور جس کا اظہار سیاسی طور پر پارلیامینٹ اور قانونی طور پر عدلیہ کی بالادستی سے ہوتا ہے۔ جبکہ قدیم روایتی اسلامی حکومتیں اپنے تاریخی ادوار میں اس قسم کے احساسِ مسئولیت سے نابلد رہی ہیں اور یہی وجہ تھی کہ قدیم مسلم نظامِ حکومت میں- جوعہدِ اموی سے عہدِ عثمانی تک دراز رہا ہے- حکام کے ظلم وستم اوراستحصال واستبداد کا عوامی ردعمل صرف اورصرف مسلح بغاوتوں اور متشدد اقدامات ہی کی صورت اختیار کرسکتا تھا جو کہ اس نے کیا۔

انسانی حقوق کے مسئلے پر-بشمول ترابی-تمام اسلام پسندوں کا موقف بڑی حد تک مضحکہ خیز ہے۔نظریاتی لحاظ سے وہ اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام نے مغرب سے صدیوں پہلے بنیادی انسانی حقوق اورحریت رائے کوقانونی مرتبہ بخشا تھا،لیکن موضوعی انداز میں یہ لوگ اپنے اس دعوے کو مدلل نہیں کرپاتے ہیں۔۱۹۶۷ء کے پارلیمانی اجلاس کے دوران اس سوال کا جواب کہ آیا کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست کا سربراہ ہوسکتا ہے، ترابی نے نفی میں دیا تھا جوان کے سابق ولاحق فکری موقف کے سراسرخلاف ہے۔ترابی کے متبعین اسلام پسندوں کی مشکل یہ ہے کہ وہ تہذیبِ جدید کی تمام نوازشوں اورترقیوں کو بیرونی دخیل اورالحادی قرار دیتے نہیں تھکتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ حضرات

اپنی عملی وواقعی زندگی میں- بغیرکسی احساسِ کرب وخلشِ ضمیر کے-تہذیبِ جدید کی تمام تجلیوں سے مستنیر اورتمام منافع سے مستفیض ہوتے رہنا بھی چاہتے ہیں۔

ماسبق تفصیلات کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ ترابی کے فکری نظریات اور عملی مواقف فی الحقیقت اسلامی نشأۃ ثانیہ میں روشن خیالی، جدت نوازی اورواقعیت پسندی کے'ترابیانہ'دعوؤں سے متناقض ومتصادم ہیں۔اپنی میتھوڈلوجی (منہجی طریقِ کار) میں روایتی اسلامی فکرکو ناقابل اعتناء بتاتے ہوئے ترابی معاصر طبقۂ علمائے دین کوعظمتِ رفتہ کے خیالی محلوں کا باشندہ خیال کرتے ہیں۔ان کے نزدیک عصرِ حاضر میں اسلامی احیائے نو اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے، جب کہ تہذیبِ جدید کے مثبت عناصرکواس میں بحسن وخوبی سمولیا جائے۔یعنی رومن کیتھولک چرچ کی واٹیکان مجلس اول ودوم کے طرز پراسلامی فکر وفلسفہ کی بھی تشکیلِ جدید کی کوششیں کی جانی ناگزیر ہیں۔ یہ تخریبی نظریہ اپنے آپ میں درست ہے یانہیں، ہمیں نہیں معلوم، البتہ اتنا یقینی ہے کہ ترابی کے متبعین اپنی فکری واخلاقی خامیوں کی وجہ سے اسلامی فکر وفلسفہ کی تشکیلِ جدید جیسے کام کی اہلیت ہرگزنہیں رکھتے ہیں۔صدرنمیری کے دورِ اقتدار میں تحریف شدہ شرعی قوانین کے نفاذ کی تائیدوتوثیق اوراس نظام بربریت وتاناشاہی سے ان کی مصالحت ومعاونت کا رویہ اس کا بین ثبوت ہے۔بعد کے زمانے میں اپنے سابقہ مواقف سے عملاً گریز کرتے ہوئے بھی انھوں نے کبھی اپنے اس موقف کو غلط شمار نہیں کیا ہے، بلکہ ہمیشہ اپنے ناقدین ومعترضین کے جواب میں تاریخی تحریف اورفکری جبر کا سہارا تلاشنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔(تفصیل کے لیے دیکھیں: الفجرالکاذب، خالد منصور: ص۲۱-۱۶۹)

مخفی لادینیت :

ترابی کے افکارونظریات پرایک دوسرے زاویے سے بھی تنقید کی گئی ہے۔سوڈان کی لبرل جماعتوں نے ترابی کے قول وعمل کے تضاد پرانگلی اٹھاتے ہوئے کہا ہے کہ دین کومتغیرانسانی ذرائع اظہاراورآفاقی لازوال اقدارکی تقسیم میں بانٹنے والے ترابی ایک مذہبی مصلح سے زیادہ علم سماجیات کے ماہرنظرآتے ہیں۔وہ نظریاتی طور پرتو دین کی اس مبدل وغیرمبدل تقسیم پر زور دیتے ہیں، لیکن میدانِ عمل میں اپنے دینی وسیاسی مخالفین کوکافرو ملحد کہنے سے احترازبھی نہیں کرتے ہیں، حالانکہ دین کی تعبیروتشریح کا جتنا حق ان کوحاصل ہے اتنا ہی ان کے سیاسی ودینی مخالفین کوبھی ہے۔

ترابی کے نزدیک اجتہاد کا حق صرف علمائے دین کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہرانسان انتہائی ممکن آزادی کے ساتھ اس کوانجام دے سکتا ہے۔ یہ اوراسی طرح کے اورنظریے اُن کولبرل

مفکرین کی صفوں سے قریب تو کرتے ہی ہیں، علاوہ ازایں ان کی تحریکی سرگرمیوں کے تصورات واہداف میں موجود مخفی لادینیت کی نقاب کشائی بھی کردیتے ہیں۔ اگرچہ بحیثیتِ مجموعی امت کے سوادِ اعظم نے ان نظریات کو یکسر نکار و مسترد کردیا ہے، لیکن بذات خود ترابی بھی ان نظریات سے پیدا ہونے والے سوالات واشکالات پر حیران وسرگرداں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ سوال کہ مذہبی احکامات کی ظاہری قابلِ تغیر شکلیں اور ابدی ولازوال غیر مبدل عناصر میں امتیاز وتفریق کا طریقۂ کار کیا ہونا چاہیے، خصوصاً جب کہ اس امتیاز کی کوئی واضح منقول مثال تاریخِ اسلامی میں نہیں ملتی ہے۔ چوں کہ بیشتر اوقات میں شریعت کے تعبدی احکامات (جیسے کہ ارکانِ دین) کی شکل وصورت اور مغز وجوہر یکساں وایک ہوتے ہیں تو ان میں تفریق وتقسیم کے لیے کیا معیار قابلِ قبول ہوگا؟ یا مثلاً اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ کسی قوم کا اپنے پارلیمانی نمائندوں کے ذریعہ شرعی احکامات میں گودے اور چھلکے کی زمرہ بندی کی خاطر اجتہاد کرنا، ہر حال میں اسلام کے ابدی عناصر کے موافق ہی ہوگا، مخالف نہیں؟ اس مقام پر آکر ترابی کسی حکومتی یا دستوری سرپرستی ونگرانی کی بات کرتے ہیں۔ غور کیا جائے تو اس حکومتی نگرانی کے دوسرے معنی بعینہ وہی نکلتے ہیں جس کو تاریخِ اسلام میں مذہبی وشرعی سند کے حامل علمائے دین کے ادارے سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے، مزید برآں شرعی اجتہاد پر حکومتی نگرانی ایک ایسی بات ہے جس کی مثال طول وطویل تاریخِ اسلام کے کسی صفحہ میں ہمیں نہیں ملتی ہے۔

دراصل ترابی اور ان کی ہمنواؤں، مثلاً ہندوستان کے ''راشد شاذ'' وغیرہ کا تجدیدی منصوبہ اسی قسم کے تضادات وتناقضات سے پُر ہے۔ ایک سماجی فینومینا (مظہرہ) کی حیثیت سے تجدیدِ دین کا مطلب ہوتا ہے کہ جدید تغیرات وانقلابات کو دینی صحائف میں مذکورہ ابدی حقائق کے تابع اور ان کے موافق بنانا، اور اس کے دو طریقے ممکن ہوسکتے ہیں۔ اولاً: جدید حوادث کو مذہبی ہدایات واحکامات کے روایتی مفہوم کے موافق بنایا لیا جائے، ثانیاً: مذہبی صحائف کی جدید واقعات وحقائق کی روشنی میں از سرِ نو تعبیر وتشریح کی جائے۔ ترابی اور ان کے متبعین دوسرے راستے کو اختیار کرتے ہیں، لیکن غالباً اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ قدیم تہذیب وروایات کے تاریخی تسلسل سے ناطہ توڑے بغیر دین وشریعت کو جدید مفہوم میں اپ ٹو ڈیٹ (مطابقِ زمانہ) نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ترابی اور ان کے ہم نوا اسلام پسندوں کی بنیادی غلطی اس قضیے کی غلط تفہیم میں مضمر ہے۔ ان حضرات کی بنیاد پرست فکر کی مشکل یہ ہے کہ وہ جدیدیت اور اس کے مظاہر جیسے عقلیت پرستی، حریت پسندی، علمی موضوعیت اور ناقدانہ زاویۂ نگاہ وغیرہ کو ان چیزوں کے اصول ولوازمات اور

فلسفیانہ متضمنات سے معریٰ دیکھنا چاہتی ہے۔ ان لوگوں کی دوسری بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ اجتماعی نظامِ زندگی اور معاشی روابط میں اصلاح وتجدید سے پہلے فکرِ اسلامی کی تجدید کے خواہش مند ہیں، یہ لوگ امتِ مسلمہ کی پسماندگی وبدحالی کے حقیقی امراض کی تشخیص کیے بغیر صرف علامات مرض کے خاتمے کے لیے ہمہ وقت وہمہ تن مصروفِ کار ومحوِ جستجو ہیں۔

ترابی عملی سطح پر مولانا مودودیؒ وسید قطب شہیدؒ کے خلافِ جمہوری رویے کو رد کرتے ہیں، لیکن بذاتِ خود بھی جمہوریت کو روبہ تحقیق لانے کے لیے کچھ شرائط وحدود متعین کرنے سے نہیں چوکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فی الوقت عالمی جمہوریت کا اسلامی ممالک بالخصوص سوڈان میں قیام ناپائیدار رہے گا اور اس کو ہر آن اس بات کا خطرہ لاحق ہوگا کہ وہ اندورنی ناکامیوں یا بیرونی استعماری سازشوں کا شکار ہوجائے۔ وہ مغربی تصورِ جمہوریت اور اسلام کے نظامِ شوریٰ میں موازنہ کرتے ہوئے مغربی جمہوریت کے نقائص کو نمایاں تو کرتے ہیں، لیکن خود ہی اس بات کو بھی قبول کرتے ہیں کہ اسلام کی سیاسی اقدار نے جمہوری نظامِ حکومت کی تشکیل ونظریہ سازی میں شورائیت اور شریعت کی بالادستی کے علاوہ کوئی خاص قابلِ ذکر کردار ادا نہیں کیا ہے۔ خود کو سوڈانی قومیت کا جز بتا کر ترابی کی تحریک جمہوری مزاج کی نمائندگی کا دم بھرتی ہے، لیکن ۱۹۸۹ء میں فوجی انقلاب کے نتیجہ میں تختِ اقتدار پر قابض ہونے کے بعد اس تحریک کا طرزِ عمل انتہائی طور پر جمہوریت مخالف ثابت ہوا تھا۔ اپنے دورِ حکومت میں نام نہاد اسلام پسندوں نے تمام سماجی اداروں وسیاسی شعبوں پر اپنی اجارہ داری قائم کرلی تھی۔ انھوں نے ایک متمدن معاشرے کے مقابلے میں استبدادی موقف اختیار کیا اور مختلف حیلے بہانوں کی آڑ میں عام انسانی حقوق کی سنگین حق تلفی کی ہے۔ لہٰذا اپنے دورانِ اقتدار سماج کو تقویت دینے اور نظامِ سیاست کو مضبوط بنانے کا ترابی اور اسلام پسندوں کا دعویٰ قابل قبول ہوسکتا تھا، بشرطیکہ وہ اپنی تحریک کی عوامی مقبولیت وسماجی اساس کو ثابت کرسکیں، لیکن افسوس صورت واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔

اصلاح یا تشکیل نو:

موجودہ اسلامی نشأۃ ثانیہ کی بحرانی صورت حال کا علاج مکمل لادینیت کو قرار دینا غلط ہوگا، جیسا کہ سوڈان کے لبرل مفکر ''عبداللہ النعیم'' (Towards an Islamic Reformation:Civil Liberties,Human Rights and International Laws) کا خیال ہے۔ ان کے مطابق اسلامی احیاء وتجدید کے موجودہ

طریقے فی نفسہ اس مشکل صورتِ حالات کا حل نہیں ہو سکتے ہیں۔عصر حاضر میں شریعتِ اسلامیہ کا دفاع کرنے والے مفکرین اور اُن کے مؤثر ترجمان کی حیثیت سے حسن ترابی کے افکار و نظریات اور طرزِ عمل اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ قدیم تہذیب و روایات کی پاسداری کا دم بھرتے ہوئے موجودہ دور میں اسلامی اصلاح و تجدید کے فکری و عملی پراسس کے حدود اربعہ کس قدر وسیع الاطراف و متعدد الجہات ہو سکتے ہیں۔ اصلاح و ترمیمِ شریعت کے پس منظر میں گفتگو کرتے ہوئے ترابی اکثر و بیشتر عمومی انداز اختیار کرتے ہیں اور معین و مقرر طرزِ گفتگو سے گریزاں نظر آتے ہیں۔

مثال کے طور پر حسن ترابی معاشرے میں عورت کے مناسب مقام کی پرزور وکالت تو کرتے ہیں، لیکن شریعت کے نقطۂ نظر سے جو کہ عورت و مرد کی جسمانی خصوصیات کا لحاظ کرتے ہوئے دونوں میں فرق و امتیاز کرتی ہے وہ عورت کے اس مزعومہ مقام کی نشاندہی نہیں کر پاتے ہیں۔ اسی طرح وہ غیر مسلموں کے مساوی حقوق پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھی متعدد ایسے قانونی رخنے چھوڑ جاتے ہیں جو غیر مسلموں کو مکمل شہری حقوق سے محروم رکھنے کے لیے کافی ہو سکتے ہیں۔ بعینہ یہی ابہام ان کے اس دعوے میں بھی نظر آتا ہے کہ حاکمِ وقت کے اختیارات شریعت کے تابع ہوں گے اور اس کی خلاف ورزی کی صورت میں اس کو بذریعۂ قوت منصبِ اقتدار سے ہٹایا جا سکے گا، حالانکہ متداول فقہی مذاہب میں اس رائے پر اتفاق نہیں ملتا ہے۔ لہٰذا کسی قدر جرأت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم روایتی اسلامی فکر سے دست کشی کے بعد ترابی کے افکار و خیالات زیادہ دور تک ہماری رہنمائی نہیں کر پاتے ہیں۔

دورِ حاضر کی جدیدیت اور اس کی اثر آفرینی کے مقابلے میں مسلم مفکرین کے سامنے دو راہیں نکلی ہیں۔ اول: دین و شریعت کو اجتماعی زندگی کے معاملات سے کاٹ کر صرف انفرادی معاملے کی حیثیت سے باقی رکھا جائے، جیسا کہ اکثر مسلم ممالک کا واقعی طرزِ عمل ہے۔ دوم: بنیادی انسانی حقوق کے اعتراضات اور بین الاقوامی دستور و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر شرعی نظامِ زندگی کو نافذ کر دیا جائے۔ مشکل یہ ہے کہ ترابی اور النعیم جیسے آزاد مسلم مفکرین کی نظر میں پہلا طریقہ اصولی طور پر قابلِ اعتراض اور موجودہ عالمی اسلامی بیداری کے پسِ منظر میں غیر واقعی و غیر عملی ہے، جبکہ دوسرا طریقہ اخلاقی لحاظ سے قابلِ مذمت اور سیاسی طور پر ناپائیدار ہے، کیوں کہ یہ ثانی الذکر طریقہ عورت اور غیر مسلم عوام کو متعدد ذلت آمیز چیزوں کا مکلّف بنا دیتا ہے۔ ترابی اس مشکل صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مناسب طریقۂ اصلاح کی یافت کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کے

تجویز کردہ طریقۂ اصلاح و تجدید (جس کے واضح خط و خال وہ ابھی تک نمایاں نہیں کر سکے ہیں) کے ذریعہ اہلِ ایمان کے لیے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ شریعت الٰہیہ پر عمل کرتے ہوئے سیکولرزم (لادینیت) کے فوائد سے بھی کما حقہ بہرہ ور ہو سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک عصرِ حاضر میں حقوقِ انسانی کا احترام اور قانونی و جمہوری روایتوں کی پاسداری نیز ایک پُرامن عالمی معاشرے کا قیام صرف لادینیت کے زیرِ سایہ ہی ممکن ہو سکتا ہے، لیکن اس کا طریقۂ کار (میتھڈلوجی) کیا ہے؟ اس کا جواب ہمیں ترابی یا ان کے ہمنواؤں کے یہاں نہیں ملتا۔

ترابی کے اساتذہ میں سے مشہور و معروف مسلم مفکر محمود محمد طہ (1909-85) کے نظریۂ نسخِ معکوس (Reverse Abrogation) میں اس میتھڈلوجی کا کچھ سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ (Towards an Islamic Reformation: Civil Libarties, Human Rights and International Laws: Abdullah Ahmad An Naim) محمد طہ کے نظریۂ نسخِ معکوس کا لفظی مفہوم قرآن کو الٹا پڑھنا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق قرآن نے وحی کے ابتدائی دور میں کچھ بنیادی اصول پیش کیے تھے، آگے چل کر جن کا عملی اظہار معاشرے کے قیام کی صورت میں سامنے آیا تھا اور پھر اسی عملی اظہار کو سنتِ رسول ﷺ مان کر تاریخ کے تمام ادوار میں ان اصولوں کی تشریح و ترجمانی کی جاتی رہی ہے۔ موجودہ دورِ ترقی میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ان ابتدائی قرآنی اصولوں کے تمام تر تاریخی اظہارات و تطبیقات - بشمول عہدِ نبوی و دورِ خلفائے راشدین - کو بالائے طاق رکھ کر ان کی از سرِ نو تعبیر و تشریح کی جائے۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ اِن بنیادی اسلامی اصولوں کو سامنے رکھ کر امتِ مسلمہ کی فکری تشکیلِ نو کا بیڑہ اٹھایا جائے۔ ان قرآنی اصولوں کا زمانۂ نزول مکہ کا ابتدائی دور تھا، لہٰذا مکہ کے آخری دور اور مکمل مدنی دور میں نازل شدہ معین و مخصوص قرآنی احکامات اور ان کی نبوی تشریحات نیز بعد کے ادوار میں ان سے مستنبط فقہی و کلامی تفصیلات کو ان آفاقی اصولوں کے تابع رکھا جائے۔ ان اصولوں پر مشتمل قرآنی آیات کو اصل آیات (Primery Verses) اور دیگر آیات کو ضمنی (Subsidiary) قرار دیا جانا چاہیے۔

محمود طہ کے الفاظ میں ''ہم الفاظ و متون سے گزر کر حکمت و مقصد سے بحث کرتے ہیں، اگر ساتویں صدی عیسوی میں کسی ضمنی آیت کی روشنی میں کچھ اصولی و بنیادی آیات کو منسوخ قرار دیا گیا تھا تو یہ عمل ہمارے لیے حجت نہیں، کیوں کہ بیسویں صدی کے عصرِ جدید میں ضمنی آیات کی

حیثیت اصولی آیات کے بالمقابل نا قابل اعتبار ہوگئی ہے۔لہٰذا اب وقت آگیا ہے کہ اصولی آیات کو ضمنی آیات پر ہر اعتبار سے فوقیت وترجیح دے دی جائے، کیوں کہ یہی وہ راستہ جس کے ذریعہ سے قرآن کی اصولی آیات کو موجودہ دور میں قابل عمل بنایا جاسکتا ہے اور ایک نئے تشریعی دستور العمل کا خاکہ تیار ہوسکتا ہے۔شرعی ارتقاء یا دینی ترقی سے ہماری مراد یہی ہے''۔(محمود طہ کی اصطلاح ''التطور الشرعی'' اور ترابی کے نظریہ ''التطویر الدینی'' میں لفظی ونظریاتی مماثلت یہاں ملحوظِ خاطر رہنی چاہیے) نسخِ معکوس کے نظریہ کی روشنی میں شریعت کی کلی تعمیرِ نو اور دین کے بنیادی اصولوں کو تاریخی استعمالات سے علیحدہ کرنا ایک نا قابل فہم اور ناممکن عمل ہے۔امتِ مسلمہ کے میراثی سرمایہ کو جس میں سنتِ رسول ﷺ ہی نہیں خود قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ شامل ہے، بیک حرکتِ قلم دریا برد کردینا نہایت تعجب خیز اور انتہائی غیر معقول طرزِ عمل ہے۔

ترابی کا یہ اصلاحی وتجدیدی منصوبہ، سیکولر طبقہ کے لیے بھی نا قابل قبول تھا۔سیکولر طبقہ کی نظر میں ترابی کی مذہبی حکومت کا لادینی طریقوں کے ذریعہ کرسیٔ اقتدار پر قابض ہونے میں قول وعمل کے واضح تضادات پائے جاتے ہیں۔ناقدین کے نزدیک ترابی اپنے اس نظریہ کے ذریعہ سے ایک طرف لادینیت کے فوائد (مثلاً جدید ادارہ سازی، حقوقِ انسانی، بین الاقوامی قوانین وغیرہ) سے بہرہ ور ہوتے رہنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف قرآن وحدیث کے غیر صالح حصوں کو برطرف کرتے ہوئے قدیم وجدید علمائے دین کی بالادستی کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں۔اپنے اس نظریہ کے بموجب وہ حکومتِ اسلامیہ کی مقدس بنیادوں کا اعتراف بھی کرتے ہیں لیکن اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے اس بحران کا کوئی شافی حل تجویز نہیں کر پاتے کہ کون ان مقدس بنیادوں کا محافظ قرار پائے گا۔لہٰذا اس کا منطقی نتیجہ صرف ایک ہی برآمد ہوسکتا ہے کہ ایسی ملغوبہ اسلامی مملکت کو لادینی و مذہبی دونوں طبقات کی تائید وحمایت حاصل نہ ہو، کیوں کہ اول الذکر کے نزدیک حکومت کی مذہبی بنیادیں قابل اعتراض ہوں گی اور ثانی الذکر کے لیے اس کے لادینی ادارے باعث نفرت قرار پائیں گے۔ایسی نام نہاد اسلامی مملکت میں دینی قانون سازی کا ادارہ یا تو محض ایک ایسا نقاب دار گڈّا (Puppet) ہوگا جو سربراہِ مملکت کے معین کردہ خطوط وحدود سے سرِ مو تجاوز نہیں کرسکتا ہے یا پھر اپنے اندرونی تضادات کے زیرِ اثر وہ ایک لامتناہی تاناشاہی ونظامِ جبر کو جنم دے بیٹھے گا جو انجام کار مذہبی ولادینی تمام فوائد کو یکساں طور پر نیست ونابود کردے گا۔

صورتِ مسئلہ کی تحدید:

ترابی اور ان کے ہم نواؤں کے یہ افکار ونظریات اس بات پر صراحتاً دلالت کرتے ہیں کہ یہ حضرات شریعتِ اسلامیہ کے روایتی حصار سے کسی طرح بھی نکلنا چاہتے ہیں۔حالات کی سنگینی اور امت مسلمہ کی حدِ حساسیت کو پہونچی ہوئی روایت پسندی ان کو اس بات سے مانع ہے کہ وہ شرعی وتاریخی حصار کو یک دم پھلانگ سکیں یا کمال اتاترک کی طرح اس حصار کو یکدم سبوتاژ (Sabotage) کردیں۔اسلامی ورثے کو از سر نو جانچنے کی ترابی کی اصلاحی کوششوں کو بعض ناقدین (جیسے محمد ارکون وغیرہ) اگرچہ روایتی مصلحانہ طریقۂ کار کی حیثیت سے رد کردیتے ہیں، لیکن قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا تنقیدی جائزہ اور خود صاحبِ رسالت ﷺ کے بعض مواقف پر علامتِ استفہام رکھنے کی بے جا جرأت وجسارت پر عام روایت پسند امتِ مسلمہ کی جانب سے جو شدید رد عمل سامنے آیا ہے، وہ اس بات کا غماز ہے کہ ایسا کوئی بھی لغو نظریہ عموم کے ساتھ امت کے سوادِ اعظم میں کھپ نہیں سکتا ہے۔قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ ترابی کی طرح خود کو روایتی عالمِ دین بتانے والے کسی مفکر کا مذہبی اصلاح وترقی کے نقاب میں تحریف وانحراف پر مبنی کوئی رویہ بے دینی کی کن کن سرحدوں تک جاسکتا ہے۔

قرآنی تفسیرات کے سوال پر ترابی نظریے سے گزر کر عمل کے میدان میں آتے ہیں اور آج کل اپنی تفسیر لکھنے میں مصروف ہیں جس میں یقیناً کچھ چونکا دینے والے نظریات سامنے آئیں گے لیکن یہاں آکر بھی مسئلہ جوں کا توں باقی رہتا ہے۔آخر ان نئی تفاسیر وتشریحات کو مرجع وقابل قبول ماننے کی کیا دلیل ہوگی؟ ان جدید افکار ونظریات کے خلاف مسلم دنیا کے شدید رد عمل کو دیکھتے ہوئے کیا یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ دین کے ان نام نہاد شارحین وترجمان حضرات کا اپنے ہی افکار و نظریات کی صحت وصالحیت پر اتنا زور دینا، شرعی تناظر میں اسلاف پسندی اور روایت پرستی کے لیے وجہِ جواز فراہم کرتا ہے؟ کیوں کہ جب شریعت میں کوئی حاکمانہ وفیصلہ کن منصب- جس کے بعد دلیل ومباحثے کی گنجائش نہ رہے- اتنا ہی ضروری ہے تو کیوں نہ اس بابت امت کے صدیوں کے تعامل کو ترجیح دی جائے۔اور اگر اسلاف نے قرآن کو اپنے زمانے کی آنکھوں سے مطالعہ کیا اور اپنے حالات وظروف کے مطابق اس کی تشریح وتفسیر کی تو کیا وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کی تشریح وتفسیر زمانے اور وقت کے حدود سے بالاتر متصور کی جائے اور شریعت کی ترجمانی میں اپنے حالات و ظروف سے متأثر نہ خیال کی جائے؟ شریعتِ اسلامیہ کی کوئی جدید تشریح اس قدر معتبر کیوں قرار دی

جائے خصوصاً جب کہ وہ پورے تاریخی اسلامی سرمایے سے صرف نظر کرتی ہو؟ اور کیوں نہ یہ مان لیا جائے کہ قدیم اسلامی ورثہ پر ان حضرات کا اعتراض کہ ماضی کا تمام فکری سرمایہ، اجتماعی حالات اور شخصی میلانات کا پروردہ رہا تھا خود انھی پر صادق آتا ہے۔ ایسا جدید طرزِ فکر و تدبر اس صورت میں مزید خطرناک اور شر پسند عناصر کا بازیچہ بن جاتا ہے، جب کہ اس کی پشت پر کوئی واضح طریقۂ کار اور روشن نظریاتی و فکری بنیادیں کارفرمانہ دکھائی پڑتی ہوں۔

ترابی اور ان کے ہم خیالوں کا تجدیدِ شریعت کا یہ نظریہ اسلامی حدود و تعزیرات کے مسئلہ پر مزید مسترد ہو جاتا ہے کیوں کہ بقولِ ترابی قرآن کریم میں ایسی آیات موجود نہیں جن کی روشنی میں حدود بیان کرنے والی واضح اور دوٹوک آیات کو منسوخ یا ان کے مفہوم کو محدود مانا جاسکے۔ اس سلسلہ میں ان کا مخلصانہ لیکن منحرفانہ مشورہ یہ ہے کہ ان حدود کے نفاذ و تطبیق کو عملاً موقوف کر دینا چاہیے۔ ترابی اور ان کے متبعین کے اس فکری موقف سے متعلق بنیادی سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس پورے منظر نامے میں ارشمیدس کا وہ مقامِ مشاہدہ (Vantage Point) کہاں ہے جس پر کھڑے ہو کر ہم اسلامی تاریخی ورثے کی جامعیت و شمولیت کا درست اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس تعلق سے محمد ارکون کا نظریہ اور ترابی کا عمل جو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں قرونِ اولیٰ اور مابعد کی مسلم نسلوں کا محاکمہ اس طور کرنا چاہیے کہ آیا وہ پیغامِ الٰہی کو سمجھنے اور اسے آئندہ نسلوں کو منتقل کرنے میں صدق و راستی اور شعور و تعقل کے اوصاف سے متصف تھیں یا نہیں؟ لیکن یہاں اشکال یہ اٹھتا ہے کہ آخر اس تعدیل و تجریح یا محاکمہ کی بنیادیں کیا ہوں گی؟ کیوں کہ ہم جن بنیادوں پر بھی فیصلہ کرنا چاہیں گے وہ فی نفسہ انھی سابقہ نسلوں کا محفوظ و منقول کردہ تاریخی سرمایہ ہوگا۔ اسلامی عقیدے و شریعت کی تعبیرِ نو کا کام بے نظیر کرشماتی شخصیات ہی کر سکتی ہیں جو کہ صرف اور صرف انبیاء و رسل ہوتے ہیں، لیکن خوش قسمتی سے ترابی کو ابھی ختم نبوت کے عقیدے پر اصرار باقی ہے۔

اس قسم کے انقلابی نظریات پیش کرنے والوں کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس کو اپنا ہم خیال و ہم فکر بنائیں۔ کیوں کہ اس سلسلہ میں ماضی کے اسلامی ورثہ کے محافظ کی حیثیت رکھنے والے طبقۂ علمائے دین سے کسی قسم کی تائید و حمایت کی توقع کرنا عبث ہوگا، لیکن ترابی اور ان کے ہم شاکلہ جدید مسلم مفکرین کے ساتھ المیہ یہ ہے کہ اسلام اور لادینیت کے ملغوبہ سے تیار شدہ ان کے افکار و نظریات کا معجونِ مرکب، امت کے دونوں دھڑوں یعنی روایت پسند اکثریت اور سیاسی میدان میں مؤثر لادینی اقلیت، دونوں کے نزدیک ناقابل اعتبار و مہمل قرار پاتا رہا ہے۔ مزید برآں

بعض قائدین کے اسی قسم کے افکار و نظریات، جدید اسلامی تحریکات کو ان کے عزیز ترین اثاثے یعنی جمہوری قوت (Democrecy Potential) سے محروم کر دیتے ہیں۔ جدت پسند اسلامی تحریکات کا مسلم ممالک میں جمہوریت و استحکام کا خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتا ہے جب کہ ان کو اپنے قابلِ عمل تجدیدی منصوبے کے لیے جمہوری تائید و حمایت حاصل ہو جائے۔ لیکن اگر ان کے منصوبے حریف لادینی تحریکات کے منصوبوں کی طرح عوام الناس میں نامقبول ہوں تو ان تحریکات کو بھی خلافِ جمہور ہی سمجھا جانا چاہیے۔

سوڈان کے مسئلہ پر فی الواقع ایسا ہوا بھی ہے۔ ترابی کے اس مجموعی اصلاحاتی منصوبے نے ان کے قابل اعتماد روایتی مذہبی طبقے میں شکوک و شبہات پیدا کر دیے تھے۔ مزید برآں صدر نمیری کے جابرانہ دورِ حکومت میں اسلامائیزیشن کی قراردادوں کی تائید و معاونت نے ترابی کی تحریک کو حریت پسند مسلم طبقہ کی ہمدردی سے بھی محروم کر دیا۔ اس صورت واقعہ نے سوڈان میں اسلامی کاز کو بھی بڑا نقصان پہنچایا ہے، کیوں کہ اس کے ذریعہ عوام الناس کو جو سبق ملا ہے وہ یہ ہے کہ شریعتِ اسلامیہ کی تنفیذ و تعمیل صرف ظلم و جبر کے سایہ میں روبہ عمل لائی جاسکتی ہے۔

نتائج :

پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے کہ ترابی کے افکار نہ صرف یہ کہ بذات خود مشکلات و پیچیدگیوں سے پُر ہیں بلکہ عملی دنیا میں ان کی تعمیل و تنفیذ بھی یکساں طور پر از قبیلِ محال ہے۔ ۱۹۸۹ء کے بعد فوجی حکومت کی سرپرستی میں ترابی کی پارٹی نے قوت و اقتدار حاصل کیا تھا لیکن ترابی کا منصوبہ پھر بھی منصوبہ ہی رہا اور عملی زمین پر روبہ عمل (Implement) نہ لایا جاسکا۔ ترابی پر اپنے سابقہ مواقف سے انحراف کا الزام بھی ہے، خصوصاً جمہوریت و اصلاح سے متعلق ان کی نظریاتی قلابازیوں کا ذکر گزشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ مجموعی طور پر اقتدار و حکومت کا ان کا تجربہ ایک مکمل بلائے ناگہانی تھا۔ کم از کم ترابی کی ذات کے سلسلے میں یہ کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ اس کے بعد ترابی نے نہ صرف سوڈانی عوام میں اپنا اعتبار کھو دیا بلکہ اپنی آزادی و طاقت کو بھی گہرا صدمہ پہنچایا ہے۔ اس عرصۂ اقتدار کے دوران ان کے بیشتر طاقتور حلیف ان کے خلاف صف بستہ ہو گئے تھے۔ دسمبر ۱۹۹۹ء میں ملکی فوجی بغاوت نے ان کے اختیارات کا خاتمہ کر دیا اور فروری ۲۰۰۱ء میں ان کو دو سال سے زائد مدت تک کے لیے قید کر دیا گیا۔ ۲۰۰۳ء کے آخر آخر میں ان کو رہائی نصیب ہوئی لیکن مارچ ۲۰۰۴ء میں ان کو فوجی بغاوت کی سازش کے الزام میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

دورانِ اقتدار متعدد اہم ایشوز (مثلاً کثیر الجماعتی سیاست اور آزادیٔ صحافت) پر ترابی کی آراء میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور عالمی پیمانے پر ان کا تنقیدی نوٹس بھی لیا گیا۔ اپنے سقوط کے بعد سے ترابی نے اپنے افکار پر متعدد بار نظر ثانی کی ہے لیکن بظاہر اس کے نتیجے میں کوئی بڑا فکری تغیر رونما نہیں ہوسکا ہے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی بامقصد خود احتسابی سے گریز کی روش ہے، بلکہ حقیقتِ واقعہ یہ ہے کہ اُن کی فروعی فکری ونظریاتی تبدیلیوں کی وجہ کلی بنیادی تفکیر نو سے زیادہ مخالفین کے مقابل مناظراتی ومجادلاتی ہتھکنڈوں کا بخوبی استعمال دکھائی پڑتا ہے۔ حکومت میں باقی ان کے متبعین نے ان کے فکری چوکھٹے اور عملی طریقۂ کار کے تیئں وفاداری نبھائی ہے لیکن سیاسی میدان میں یہ اتباع وعقیدت کا تعلق کسی بار آور تبدیلی کا شاخسانہ نہیں بن سکا۔ بہر حال ترابی کی تحریک ان کی علیحدگی وعزلت نشینی سے فکری ونظریاتی خلا سے دوچار ہے۔

جدید اسلامی فکر اور نو اسلامائزیشن کے عمل میں ترابی کا کردار، جدید اسلامی اصلاح پسندی کے دائرہ کار کی محدودیت کو اُجاگر کرتا ہے۔ امت مسلمہ میں تلقّیٔ قبول کا مرتبہ حاصل کرچکی تشریح و تفسیر کے خلاف، اسلامی عقیدے کی مجموعی تفکیرِ نو کا دم بھرنے والے جدید مسلم مفکرین دانستہ یا نادانستہ طور پر جدید اسلامی بیداری کی لہر کو اس کی قوت وطاقت کے اصل سرچشمہ یعنی جمہوری حمایت و تائید سے محروم کررہے ہیں۔ اسلامی شریعت وعقیدے کی تعبیر نو کرنے والے مفکرین، مسلم عوام سے اپنی دوری وبیگانگی میں لادینی مفکرین کے ہم پلہ وہم رکاب ہیں۔ اس منظر نامہ میں ترابی کی حالت بے حد خستہ ہے کیوں کہ وہ دینی وشرعی بنیادوں پر روایت پسند علماء وعوام کے معتوب ہوئے اور سیاسی وفکری بنیادوں پر حریت پسند وجدت پرست حلقوں کا ہدفِ ملامت بنے۔ میدانِ سیاست میں ان کی جولانیوں نے ان کے قابلِ عمل یا کم از کم قابلِ غور اصلاحاتی افکار ونظریات کے نفوذ وتاثیر کو سست گام کردیا۔ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے ان کو کئی ایسے کام کرنے پڑے جو کم وبیش ان کے پیش کردہ افکار وتصورات سے متصادم تھے۔

مصلحت پرست سیاست اور اصلاح پسند افکار کا گٹھ بندھن اکثر وبیشتر تاناشاہی وجابرانہ طرز حکومت کی شکل اختیار کرلیتا ہے، کیوں کہ ایک مصلح کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام الناس کی پسند و ناپسند سے بالاتر ہوکر اپنی فکری واصلاحی ذمہ داری انجام دے، جبکہ اس کے برعکس ایک سیاسی قائد اپنے پروگرام میں ہزار تبدیلیاں اور مصالحت ورعایت پیدا کرتے ہوئے عوام کے میلانات کا پاس و لحاظ کرتا ہے۔ اصلاح وتجدید اور سیاست وحکومت دونوں کی الحاقی صورت میں اگر اول اول عوامی تائید واخلاقی استناد مل بھی جائے، لیکن کچھ عرصہ بعد ناگزیر ہوجاتا ہے کہ اس لقاح وقران کے نتیجے

میں ہولناک قسم کا جبر وتشدد جنم لے۔

عصر جدید کے حقائق کے بالمقابل روایت پسند عوام وخواص کا طرزِ عمل بھی بڑی حد تک تشویشناک ہے۔ اب روایت پسند عوام وخواص کو یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ماضی کے افکار ونظریات میں کھوئے رہنا اور اسلاف پرستی کی رو میں ہر تاریخی میراث کو- خواہ وہ کتنی ہی ناقابل عمل ونالائقِ اعتبار ہو- درجۂ استناد بخشتے رہنا، امت مسلمہ کے مفادِ عامہ کے لیے بھی مضرت رساں ہے۔ کیوں کہ اس کا سیدھا نتیجہ عملی دورخی (Practical Dichotomy) کی صورت میں برآمد ہوگا۔ یعنی شریعت کو نظریاتی سطح پر محفوظ رکھا جائے، اگرچہ زائچۂ عمل تمام تر اس کے خلاف بھرا جاتا رہے۔ آج روایت پرستی کے تنگ گلیاروں سے نکل کر زمینی وواقعی حقائق ومسلّمات کی روشنی میں قدیم روایتی مفروضات کی اصلاح وترمیم کی جانی چاہیے، تاکہ رہتی دنیا تک کے لیے رشد وہدایت کا سرچشمہ دینِ اسلامی نئی ضروریات وتصورات کا کما حقہ مقابلہ کرسکے۔ لہٰذا روایت پسندی یا اسلاف پرستی پر مسرفانہ اصرار خود امتِ مسلمہ میں جمود وتعطل اور اس کے ردعمل میں لادینیت پرستی کا سبب بن سکتا ہے۔

بہر حال ان جدید مکاتب ہائے فکر کی ناکامی بڑی حد تک اسلامی فکر کے جمود وتعطل کا سبب بنی ہے جس کے نتیجہ میں اسلامی ممالک میں جابرانہ نظام حکومت اور فوجی انقلابات کا سرطان سا پھیلتا گیا ہے۔ واضح رہے کہ حکومت بالجبر ایک پُرخطر مہم ہے جس کی خطرناکیاں اپنوں اور غیروں کی تقسیم سے ناآشنا ہوتی ہیں۔ ماضی قریب میں سوڈان میں رونما ہونے والے تغیرات اس کی واضح نشاندہی کررہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ حسن ترابی کے لیے یہ ایک بے حد مہنگا سبق ثابت ہوا ہے جو سیکھا گیا، لیکن بہت دیر سے۔

مراجع: **عربی**:

(۱)قضایا الوحدة الاسلامية :حسن الترابى (۲)تجديد اصول الفقه :حسن الترابى(۳)تجديد الفكر الاسلامى :حسن الترابى(۴)الاشكال الناظمة لدولة اسلامية معاصرة :حسن الترابى(۵)تجديد الدين :حسن الترابى(۶)منهجية التشريع :حسن الترابى(۷)المصطلحات السياسية فى الاسلام :حسن الترابى(۸)الدين والفن :حسن الترابى(۹)المرأة بين تعاليم الدين وتقاليد المجتمع :حسن الترابى(۱۰)السياسة والحكم :حسن الترابى(۱۱)التفسير التوحدى :حسن الترابى(۱۲)عبرة المسيرلاثنى عشر السنين :حسن الترابى(۱۳)الصلوة؟ عماد الدين :حسن الترابى(۱۴)الايمان واثره فى الحياة :حسن الترابى(۱۵)الحركة الاسلامية : التطور والنهج والكسب :حسن الترابى(۱۶)مآزق الشريعة وتحديات التحريف :عاطف احمد عاطف (۱۷)ازمة الاسلام السياسى: الجبهة السياسية القومية النموذجية :ابراهيم حيدر على(۱۸)الدكتور الحسن ترابى وفساد نظريات تطوير الدين :عبد الفتاح محجوب ابراهيم (۱۹)الفجر الكاذب: نميرى وتحريف الشريعة :الدكتور منصور خالد(۲۰)الحركة الاسلامية فى السودان :حسن المكى(۲۱)الصارم المسلول فى الرد على الترابى شاتم الرسول :ابى عبد الله احمد بن مالک (۲۲)مشروع القانون الجنائى المخالف للشريعة :اواد الكريم موسىٰ

کیا قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے

ادارہ☆

قرآن مجید کی تعریف

قرآن 'فُعلان' کے وزن پر مصدر ہے، خود اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب کا یہ نام رکھا ہے
"وقرآنا فرقناه لتقرأه على الناس على مكث ونزلناه تنزيلا" (الاسراء:۱۰۶)

قرآن کے معنی پڑھنے، پڑھ کر سنانے، جمع کرنے اور ملانے کے آتے ہیں (لسان العرب مادہ ق ر ء) یہ معانی اس امر کی جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ کتاب بار بار پڑھی جائے اور تلاوت و عمل کے ذریعہ دنیا کے سامنے اسے سنانا اس کا حق ہے نیز اس کی جملہ سورتیں ایک دوسرے سے مربوط، ملی ہوئی ہیں اور یہ کہ عہد نبوی ہی میں اس کی آیات وسورتوں کی جمع وترتیب قائم کرائی گئی تھی۔

اصطلاحی تعریف

اصطلاح میں قرآن اس کلام کو کہتے ہیں جس کی وحی نبی اکرم ﷺ کی جانب کی گئی اور جو مصاحف میں مرقوم اور ایک سو چودہ سورتوں پر مشتمل ہے۔ جس کی پہلی سورہ 'الفاتحۃ' اور آخری سورہ 'الناس' ہے۔

قرآن مجید مسلمانوں کا ہمہ گیر ضابطہ حیات ہے یہ مذہبی ضابطہ بھی ہے اور سماجی بھی، دیوانی بھی، فوجداری بھی۔ یہ قرآن دساتیر عالم پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں کسی مخصوص علاقے، خطے یا نسل وقوم کے مفادات کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔ پوری انسانیت ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کے حقوق و مفادات کا تحفظ کیا گیا ہے۔ اسی لیے اس کے نزول کو پورے عالم کے لیے رحمت قرار دیا گیا ہے۔

تمام ہی آسمانی کتابوں کا یہ عطر اور نچوڑ ہے اور اپنی محفوظیت، زندہ زبان، تاثیر وشفاء، اختلافات سے خالی ہونے، الہامی اور انسانی فطرت کے مطابق ہونے، اصول وکلیات کے بیان اور جزئیات سے اجتناب، مربوط ومنظم ہونے اور سیرت نبویہ کی شکل میں اپنی زندہ اور عملی شرح کے حامل

ہونے کے اعتبار سے تمام ہی صحف سماویہ پر فوقیت رکھتا ہے۔

قرآن مجید سراپا خیر وبرکت ہے اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور ایک مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ عرب کے چرواہوں کو اس نے اقوام عالم کا ہادی و رہنما بنا دیا۔ اس کے نزول کا بنیادی مقصد ہی اپنے متبعین کو انسانیت کے لیے باعث شرف و افتخار بنانا تھا۔ ارشاد خداوندی ہے "انه ذكر لك و لقومك" (الزخرف:۴۴) یقیناً یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے باعث شرف ہے۔

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کے دلائل

(۱) کتاب أنزلناه اليك مبارك ليدبروا آياته وليتذكر اولو الالباب (سورہ ص:۲۹) یہ کتاب جس کو ہم نے آپ کی جانب نازل کیا ہے بابرکت ہے تاکہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور عقل والے نصیحت حاصل کریں۔ یہ آیت صراحتاً قرآن مجید پر تدبر وتفکر کرنے کے وجوب پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ "لیدبروا" فعل امر ہے اور امر کا صیغہ وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبیؒ نے اس آیت سے قرآن مجید کے معانی کی معرفت کو واجب قرار دیا ہے۔ (دیکھیے: الجامع لأحکام القرآن ۱۵/۱۹۲)

(۲) "أفلا يتدبرون القرآن" (النساء:۸۲) کیا یہ قرآن پر غور وتدبر نہیں کرتے۔

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کا یہ قول قرآن مجید پر تدبر کے وجوب پر دلالت کرتا ہے تاکہ اس کے معانی کو جانا جاسکے اور اس میں نظر واستدلال کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ (الجامع لأحکام القرآن ۵/۲۹۰)

امام ابن تیمیہؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وتدبر الكلام بدون فهم معانيه لا يمكن و لذلك قال تعالىٰ: [انا أنزلناه قرآنا عربيا لعلكم تعقلون](يوسف: ۲) وعقل الكلام متضمن لفهمه ومن المعلوم أن كل كلام فالمقصود منه فهم معانيه دون مجرد ألفاظه، فالقرآن أولى بذلك" (مقدمہ فی اصول التفسیر، مجموع الفتاوی ۱۳/۳۳۲)

اور کلام الٰہی پر تدبر اس کے معانی کو سمجھے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سورہ یوسف میں فرمایا: یقیناً ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں نازل فرمایا ہے تاکہ تم لوگ سوچو۔ اور کلام پر سوچنا اس کے معانی کو سمجھنے پر مشتمل ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ ہر کلام کا مقصود اس کے معانی کو سمجھنا ہی ہوتا ہے۔ مجرد الفاظ مقصود نہیں ہوتے تو قرآن مجید بدرجہ اولیٰ اس کا حقدار ہے۔

(۳) سورہ محمد میں ہے "أفلا يتدبرون القرآن أم على قلوب أقفالها" (۲۴) کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

(۴) كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم تعقلون (البقرہ:۲۴۲) ويقول سبحانه "ولقد ضربنا للناس فى هذا القرآن من كل مثل لعلهم يتذكرون قرآنا عربيا غير ذى عوج لعلهم يتقون" (الزمر:۲۷-۲۸)

اسی طرح اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے لیے اپنی آیات کی توضیح کرتا ہے تا کہ تم سوچو اور عقل سے کام لو۔ اور ہم نے اس قرآن میں ہر طرح کی مثال پیش کی ہے تا کہ وہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ یہ قرآن عربی زبان میں ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے، شاید کہ یہ لوگ تقویٰ اختیار کریں۔

علامہ ابن جریر لکھتے ہیں: قرآن مجید کی آیات میں موجود مواعظ اور دلائل پر اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جو ترغیب دی ہے۔ یہ ترغیب قرآنی آیات کی اس تاویل کی معرفت کے وجوب پر دلالت کرتی ہے جو لوگوں سے پوشیدہ نہیں کیونکہ جو شخص بات کو نہ سمجھ رہا ہو اور اس کی تاویل سے واقف نہ ہو اس سے یہ کہنا کہ اس چیز سے عبرت حاصل کرو جس کا فہم تمہیں حاصل نہیں محال بات ہے الا آنکہ اس حکم کو اس بات پر محمول کیا جائے کہ امر کا یہ صیغہ فہم آیات اور پھر تدبر و اعتبار پر دلالت کر رہا ہے۔

(۵) ولقد يسرنا القرآن للذكر فهل من مدكر (القمر:۱۷) ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان بنایا ہے پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا۔

ظاہر ہے قرآن سے نصیحت اسی وقت حاصل کی جا سکتی ہے جب اسے دل کی یکسوئی کے ساتھ سوچ سمجھ کر پڑھا جائے، اس کے مضامین پر غور و فکر کیا جائے۔

احادیثی دلائل:

(۱) خيركم من تعلم القرآن وعلمه (الترمذی:۲۹۰۹) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے۔

امام ابن تیمیہؒ کہتے ہیں "اس حدیث کے مفہوم میں قرآن مجید کے حروف و معانی کی تعلیم بھی داخل ہے بلکہ معانی کی تعلیم ہی اس کے حروف کے سیکھنے کا اصل مقصود ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ایمان میں اضافہ کا باعث بنتی ہے جیسا کہ جندب بن عبداللہ اور عبداللہ بن عمر وغیرہ نے فرمایا:

ہم نے ایمان سیکھا پھر قرآن، تو ہم ایمان کے لحاظ سے زیادہ ہو گئے اور تم لوگوں نے قرآن سیکھا پھر ایمان کی تعلیم حاصل کی، اسی لیے صحابہ کرام ایک سورہ کو یاد کرنے میں ایک مدت

لگا دیتے تھے۔ (الفتاوی:۱۳/۳۰۴)

(۲) نبی اکرم ﷺ نے عبداللہ بن عباسؓ کو اپنے سینے سے لگایا اور یوں دعا فرمائی: اے اللہ اسے کتاب کی تعلیم دے "اللهم علّمه الكتاب" اور ایک روایت میں ہے "علمه الحكمة" (صحیح البخاری:۳۷۵۶) اے اللہ انھیں حکمت کی تعلیم دے۔

علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں: حدیث میں مذکور حکمت کے بارے میں شارحین حدیث کے اقوال مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ قرآن اور بعض کہتے ہیں قرآن میں درست رائے تک پہنچنا اور بعض کہتے ہیں اللہ کی جانب سے عطا کردہ فہم اور قریب ترین تاویل یہ ہے کہ اس سے مراد قرآن مجید کا فہم ہے۔ (فتح الباری ۱/۱۷۰)

(۳) عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے نبی اکرم ﷺ سے اس مدت کے متعلق سوال کیا جس میں قرآن مجید کو ختم کیا جائے تو آپ ﷺ نے فرمایا: "ایک ماہ میں اسے پڑھو، اس پر عبداللہ بن عمرو نے کہا: میں اس سے زیادہ پڑھنے پر قادر ہوں تو آپؐ نے فرمایا: پچیس دن میں ختم کرو، اسے پندرہ دن میں پڑھو، سات دن میں پڑھو، جو تین دن سے بھی کم مدت میں قرآن مجید کو ختم کرے گا وہ اس کے معانی کو نہیں سمجھ پائے گا۔" (رواہ الامام احمد فی مسندہ وصححہ الالبانی فی السلسلۃ الصحیحہ /۱۵۱۳)

آثار سلف

نزول قرآن کا بنیادی ہدف انسانوں کی رہنمائی ہے اور ظاہر ہے قرآن کی ہدایت سے استفادہ اور اس کی آیات سے شفا اسی وقت مل سکتی ہے جب اسے سمجھ کر پڑھا جائے، اسی لیے صحابہ کرام اور تابعین نے قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی نہ صرف ترغیب دی ہے بلکہ بلا سمجھے پڑھنے پر اس کے نقصانات سے آگاہ بھی کیا ہے۔

چند آثار ملاحظہ ہوں:

(۱) عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں ہم میں سے جب کوئی دس آیات کو سیکھ لیتا تو ان سے آگے نہ بڑھتا یہاں تک کہ ان کے معانی کو جان لیتا اور ان پر عمل نہ کر لیتا۔ (الطبری ۱/۶۰، ۸۱)

(۲) علی بن ابی طالبؓ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم کوئی آیت نہیں نازل ہوئی مگر میں جانتا ہوں کہ کس سلسلے میں نازل ہوئی، کہاں نازل ہوئی اور کس پر نازل ہوئی۔ (الطبقات الکبری، ابن سعد ۴/۱۵۴)

(۳) موطا امام مالک میں ہے کہ ابن عمرؓ سورہ البقرہ کو سیکھنے میں آٹھ سال لگا دئے۔ (الموطأ ۱/۲۰۵)

(۴) ابن عمرؓ کہتے ہیں عمرؓ نے سورہ البقرہ کو بارہ سال میں سیکھا اور جب اس کو ختم کرلیا تو بعض اونٹوں کو ذبح کیا۔ (ابن سعد فی الطبقات ۴/۱۲۱)

یہ آثار اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عہد صحابہ میں بلا سمجھے قرآن کو پڑھنے کا رواج نہ تھا بلکہ ایک ایک آیت پر کئی کئی دن اور ایک ایک سورہ پر کئی کئی سال وہ لگا دیتے تھے تاکہ قرآن مجید کی ہدایت سے زندگی وفکر کے ہر مرحلے پر اس کی حکمتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

(۵) مسروق کہتے ہیں: عبداللہ بن عباسؓ ہمارے سامنے سورہ کی تلاوت کرتے پھر اس بابت احادیث بیان کرتے اور رات کے زیادہ تر حصے میں اس کی تفسیر کرتے۔ (طبری ۱/۶۰، ۸۴)

تابعین کے اقوال

(۱) مجاہدؒ کہتے ہیں میں نے مصحف کو ابن عباسؓ کے سامنے تین بار سورہ الفاتحہ سے سورہ الناس تک پیش کیا، ہر آیت کے سامنے میں ان کو روکتا اور اس کے بارے میں دریافت کرتا۔ (مقدمہ فی اصول التفسیر: ۱۰۲)

(۲) حسن بصریؒ کہتے ہیں:

"ماأنزل الله آية الا احب أن اعلم فيم نزلت وماذا عنى بها" (زادالمسیر ۱/۴)

اللہ تعالیٰ نے کوئی آیت نازل نہیں کی مگر میں اس بات کو جاننا پسند کرتا ہوں کہ وہ آیت کس چیز کے بارے میں نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے اس سے کیا مراد لیا ہے۔

مفسرین کے اقوال

(۱) علامہ زرکشی لکھتے ہیں: "من لم يكن له علم و فهم و تقوى و تدبر لم يدرك من لذة القرآن شيئا" (الزرکشی، البرہان ۲/۱۷۱)

جس شخص کے پاس علم وفہم اور تقوی وتدبر نہ ہو وہ قرآن کی لذت میں سے کچھ بھی نہیں پائے گا۔

(۲) معجم الادباء میں ہے: "انی لأعجب ممن قرأ القرآن ولم يعلم تاويله كيف يلتذ بقرأته" (۱۸/۶۳)

مجھے اس شخص پر تعجب ہے جو قرآن کی تلاوت کرے اور اس کی تاویل وتفسیر سے ناواقف ہو تو آخر وہ کیسے اس کی تلاوت سے لذت حاصل کرے گا۔

(۳) علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

"من تدبر القرآن طالباً للهدى منه تبين له طريق الحق" جس شخص نے قرآن سے ہدایت چاہتے ہوئے اس پر تدبر کیا اس کے لیے حق کا راستہ واضح ہوجاتا ہے۔

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کے تئیں بعض شبہات اور اس کا ازالہ

عموماً مسلمانوں کے درمیان یہ شبہ رائج ہے کہ ہر شخص قرآن مجید کو نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید پر غور وتدبر کے لیے جملہ شرعی ولغوی علوم کی تحصیل ضروری ہے۔

یہ شبہ دراصل شیطان کا ایک وسوسہ ہے۔ فہم قرآن کے دو مراتب ہیں۔ ایک اس کی آیات وقصوں سے ہدایت وعبرت حاصل کرنا، جو معمولی واقفیت رکھنے والا بھی حاصل کرسکتا ہے بلکہ عربی زبان سے نابلد شخص بھی تفاسیر وتراجم کی مدد سے اسے پا سکتا ہے۔ دوسرے شرعی احکام کا استنباط جو علماء اور متخصصین کا وظیفہ ہے۔

قرآن سے عبرت ونصیحت ہر مرد وعورت حاصل کرسکتا ہے، قرآن کسی ایک گروہ یا جماعت کو مخاطب نہیں کرتا بلکہ یہ مرد وعورت، عالم وجاہل، عربی وعجمی سب کو یکساں مخاطب بناتا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے: "تبارك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيرا" (الفرقان/۱) بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر فرقان نازل فرمایا تاکہ وہ پوری دنیا والوں کے لیے ڈرانے والا ہو۔

اور اگر اس کتاب کے مخاطب صرف علماء وفقہاء ہوتے تو اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں سے اس پر غور وتدبر کا مطالبہ نہ کرتے۔

أفلا يتدبرون القرآن ولو كان من عند غير الله لوجدو ا فيه اختلافا كثيرا (النساء:۸۲) کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے اگر یہ غیر اللہ کی جانب سے ہوتا تو یہ لوگ اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

ابن ہبیرہ کہتے ہیں ''شیطان کی چالوں میں سے ایک چال یہ بھی ہے کہ وہ بندوں کو قرآن پر تدبر سے بدکاتا ہے کیونکہ اسے یہ بات معلوم ہے کہ تدبر کے وقت ہدایت مل کر رہے گی۔ چنانچہ وہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ پر خطر راہ ہے یہاں تک کہ انسان یہ کہنے لگتا ہے: زہد وتورع کی بنا پر میں قرآن کے معانی پر کلام نہیں کروں گا۔'' (ذیل طبقات الحنابلہ لابن رجبؒ ۳/۲۷۳)

قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کے فوائد

(۱) تدبر قرآن اور فہم قرآن سے دنیوی واخروی برکتوں کا حصول ہوتا ہے۔ هذا كتاب

انزلناه مبارك ليدبروا آياته

(۲) قرآن کی ہدایت ورہنمائی سے استفادہ۔قرآن مجید ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو دنیوی واخروی سعادت کی راہ دکھلاتا ہے۔سورہ الاعراف میں ہے:

هذا بصائر من ربكم وهدى و رحمة لقوم يومنون (۲۳) یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے بصیرت افروز حقائق، ہدایت اور مومنوں کے لیے رحمت ہے۔

سورہ الاسراء میں ہے "ان هذا القرآن يهدى للتى هى اقوم"(۹)

امام سعدی ''اقوم'' کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں یعنی سب سے زیادہ معزز، نفیس، درست اور امور ومعاملات کی درستگی کے لیے سب سے زیادہ عظیم راستہ کی جانب یہ قرآن رہنمائی فرماتا ہے۔(القواعد الحسان:۱۴۵)

اس ہدایت ورہنمائی، روشنی ورحمت کا حصول تدبر وتفکر کے بغیر ممکن نہیں۔قرآن مجید دلوں کی بیماریوں کے علاج کے لیے نازل ہوا ہے اور بندگان خدا کو مشرکانہ عقائد واعمال کے اندھیروں سے نکال کر انہیں اسلام کی روشنی وتابناک فضا سے ہمکنار کرنے کے لیے نازل ہوا ہے، اس لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ اسے سمجھ کر پڑھا جائے۔اس لیے کہ جب تک اسے سمجھا نہ جائے گا اس کی تعلیمات سے بے خبری رہے گی اور قرآن سے ہدایت اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب اس کی تعلیمات سے آگاہی حاصل ہو اور یہی اس کے نزول کا مقصد بھی ہے۔

(۳) فہم قرآن سے قلب کا زنگ دور ہوتا ہے:

"ان القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا أصابه الماء، قيل يا رسول الله وما جلاء ها قال تلاوة القرآن و كثرة ذكر الموت" (البیہقی) جس طرح پانی پڑجانے سے لوہا زنگ آلود ہوجاتا ہے اسی طرح دل بھی گناہوں سے زنگ آلود ہوجاتا ہے۔صحابہ کرامؓ نے پوچھا یارسول اللہ اس کی صفائی کیسے ہوگی؟ فرمایا: تلاوت قرآن اور زیادہ سے زیادہ موت کی یاد سے۔

(۴) سستی وکاہلی کا خاتمہ اور شریعت پر عمل کی ترغیب

مالداری انسان کو شریعت پر عمل کرنے میں سستی وکاہلی کی جانب لے جاتی ہے اور بسا اوقات دلوں کو سنگدلی تک پہنچا دیتی ہے جس کا خاتمہ قرآنی آیات پر خشوع وخضوع کے ساتھ تدبر کے بغیر ممکن نہیں اور بلا تدبر کے تلاوت سے دلوں کی اس بیماری کا ازالہ ممکن نہیں۔

عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں ''بعض لوگ قرآن مجید کو اس طرح پڑھتے ہیں کہ وہ ان کے

حلقوم سے نیچے نہیں اترتا لیکن جب قرآن دل پر اثر انداز ہوتا ہے تو اس کے معانی دل میں راسخ ہوجاتے ہیں تو اس کا پڑھنا نفع پہنچاتا ہے۔'' (رواہ مسلم فی صحیحہ:۱۸۵۸)

(۵) ایمان ویقین میں اضافہ اور قلب کا نور سے بھر جانا۔

تدبر وتفکر کے ساتھ قرآن مجید کا سماع دلوں کو نور وایمان سے بھر دیتا ہے۔جندبؓ بن عبداللہ فرماتے ہیں: ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ تھے درانحالیکہ ہم طاقتور نوجوان تھے تو قرآن مجید کو سیکھنے سے پہلے ہم نے ایمان سیکھا پھر قرآن سیکھا تو ہم ایمان کے اعتبار سے اور زیادہ ہوگئے۔(سنن ابن ماجہ:۷)

(۶) آخرت کی جانب میلان

یہ دنیا اور اس کی لذات انسان کو اپنی جانب کھینچتی ہیں اور خواہشات کی وادیوں میں ایسا گراتی ہیں کہ وہ ان کا اسیر ہوکر رہ جاتا ہے۔جس سے اس کی آخرت برباد ہوجاتی ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں خواہشات کی غلام قوموں کی ہلاکت کی داستانیں، حشر ونشر اور جنت ودوزخ کے مناظر انتہائی موثر اسلوب میں بیان کیے گئے ہیں جو شخص بھی ان مضامین کو سمجھ بوجھ کر پڑھے گا اس کا دل اللہ کی طرف مائل ہوگا، آخرت کے خوف سے وہ کانپ اٹھے گا اور پھر اس کا دل اپنی عاقبت کو سنوارنے اور پوری زندگی کو اللہ کی مرضی اور اسی کے قانون کے مطابق ڈھالنے کے لیے مضطرب ہوجائے گا۔

(۷) دین کا گہرا علم ہونے کے باوجود بسا اوقات انسان اپنی خواہشات پر قابو نہیں پاتا اور گناہ کر بیٹھتا ہے، اس لیے ہمیشہ قرآن کا مطالعہ کرتے رہنا چاہیے کہ اس سے قیامت کے محاسبہ کا تصور پختہ سے پختہ تر ہوتا جائے گا اور انسان گناہ کرنے سے بچ پائے گا۔قرآن کے موثر اور بلیغ مواعظ شہوات پر کاری ضرب لگائیں گے۔

ارشاد باری ہے"انما المومنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم واذا تليت عليهم آياته زادتهم ايمانا وعلى ربهم يتوكلون" (الانفال:۲) یقیناً مومن وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں اور جب ان کے سامنے اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو یہ قرأت ان کے ایمان میں اضافہ کردیتی ہے اور وہ اپنے رب پر بھروسہ کرتے ہیں۔

(۸) آج امت مسلکی، سیاسی اور عقائد کے اعتبار سے سینکڑوں فرقوں اور گروہوں میں منقسم ہوگئی ہے۔اس صورتحال کے خاتمہ کے لیے عقائد کے سرچشمہ سے براہ راست فیض حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور ظاہر ہے قرآن کو سمجھ کر پڑھے بغیر اس سے فیض حاصل نہیں کیا جاسکتا۔

نیز پچھلی قوموں اور امتوں کے درمیان اختلاف کے اسباب وعوامل کا قرآن نے تفصیلی

تعارف کرایا ہے۔اس کو سمجھ کر پڑھنے کی صورت میں ان اسباب سے واقفیت ہوگی اور مسلمان ان سے اجتناب کریں گے تو ہماری صفوں میں در آیا ہے، یہ اختلاف بتدریج مٹ جائے گا یا کم ہو جائے گا۔

(۹) غموں کے ازالہ کا ذریعہ

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اگر کسی بندے کو کوئی غم یا فکر لاحق ہو اور وہ یہ دعا پڑھے:"اللھم انی عبدك وابن عبدك ، ابن امتك ، ناصيتی بيدك، ماضٍ فی حكمك، عدل فی قضاؤك، اسئلك بكل اسم هو لك، سميت به نفسك أو أنزلته فی كتابك اوعلمته احدا من خلقك أو استأثرت به فی علم الغيب عندك أن تجعل القرآن ربيع قلبی و نور صدری و جلاء حزنی و ذهاب همی و غمی " تو اللہ تعالیٰ اس کے غم اور فکر کو دور کر دیتا ہے اور اس کی جگہ اسے فرح وسرور سے ہمکنار کرتا ہے۔(صحیح الکلم الطیب/۱۲۳)

علامہ ابن القیم اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور چونکہ حزن وغم دل کی زندگی اور اس کے روشن ہونے سے متضاد ہے اس لیے نبی اکرمؐ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ اس کا ازالہ قرآن کے ذریعہ ہو کیونکہ اس صورت میں غم وفکر کی واپسی ممکن نہیں، البتہ اگر آپ قرآن کے علاوہ صحت، دنیا، جاہ ومنصب، بیوی یا اولاد کے ذریعہ دل کے غم کو دور کرنے کی کوشش کریں گے تو ان چیزوں کے خاتمہ کے بعد غم دوبارہ عود کر آئے گا۔(الفوائد، ابن القیم ۴۰)

(۱۰) اطمینان قلب کا ذریعہ

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں "ان هذا القرآن مادبة الله فی الارض فمن دخل فيه فهو آمن "(فضائل القرآن، الفریابی/۱۶۱)

یہ قرآن زمین میں اللہ کا دسترخوان ہے جو شخص اس میں داخل ہو گیا وہ مامون ہو گیا۔

اخروی فوائد

(۱) عذاب قبر سے نجات

ترمذی شریف میں ہے کہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے اپنا خیمہ ایک قبر پر گاڑ دیا، درانحالیکہ وہ اسے قبر نہیں گمان کر رہے تھے تو اچانک آپ نے سنا کہ کوئی شخص قبر کے اندر سورہ الملک کی تلاوت کر رہا ہے اور اس نے پوری سورہ کی تلاوت مکمل کی پھر وہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اے اللہ کے رسولؐ میں نے اپنا خیمہ ایک قبر پر نصب کر دیا درانحالیکہ میں اسے قبر نہیں

سمجھ رہا تھا تو اچانک ایک شخص اس قبر کے اندر سے سورۃ الملک کی تلاوت کرنے لگا اور اس نے اس سورہ کی تلاوت مکمل فرمائی، اس پر آپؐ نے فرمایا"هی المانعة هی المنجية من عذاب القبر" (رواہ الترمذی وقال: حدیث حسن غریب) یہ عذاب قبر کو روکنے والی اور اس سے بچانے والی سورہ ہے۔

(۲) سورۃ الملک کی تلاوت، تلاوت کرنے والے کی جانب سے اللہ تعالیٰ سے مجادلہ و مباحثہ کرے گی۔

(۳) قرآن کی شفاعت کا حصول

ابوامامہ الباہلیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرمؐ کو فرماتے ہوئے سنا: اقرأوا القرآن فانه ياتی يوم القيامة شفيعاً لاصحابه (اخرجہ مسلم فی کتاب صلاۃ المسافرین، باب قرأۃ القرآن /۸۰۴)

قرآن کو پڑھو کیونکہ قرآن مجید قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کے حق میں سفارش کرے گا۔

قرآن مجید کو سمجھ کر نہ پڑھنے کے نقصانات

(۱) قرآن مجید کی ہدایت ورہنمائی سے محرومی۔

(۲) خواہشات اور شیطان کی غلامی میں چلے جانے کا خطرہ

(۳) دلوں کی تنگی اور اطمینان وسکینت کا فقدان۔

ارشاد ربانی ہے: فمن اتبع هدای فلا يضل و لا يشقی ومن اعرض عن ذكری فان له معيشة ضنكاً (طٰہٰ:۱۲۳-۱۲۴) تو جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ تو وہ گمراہ ہوگا اور نہ ہی بدبختی کا شکار اور جو شخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا اس کے لیے تنگ زندگی ہوگی۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی پیروی کرنے والے کے لیے دنیا میں گمراہ نہ ہونے اور آخرت میں بدبختی کا شکار نہ ہونے کی ضمانت لی ہے۔ گویا اس کی پیروی نہ کرنے والے گمراہی اور بدبختی کا شکار ہوں گے۔

(۴) شفاعت رسول اللہ ﷺ سے محرومی اور ان کے غضب کا سامنا

قرآن مجید میں ایک جگہ اس مقدمے کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو حضور ﷺ قیامت کے دن خدا کی عدالت میں دائر کریں گے، اے میرے رب جن لوگوں کے درمیان تو نے مجھے قرآن پاک دے کر بھیجا تھا انہوں نے اس کے ساتھ ایسا معاملہ کیا جیسا کوئی شخص گری پڑی ردی چیز کے ساتھ کرتا ہے۔"وقال الرسولؐ يا رب ان قومی اتخذوا هذا القرآن مهجورا"

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

’’مشرکین کی طرف سے قرآن کا چھوڑنا یہ تھا کہ ان کے سامنے جب قرآن کا پیغام پیش کیا جاتا تو وہ شور و ہنگامہ مچاتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور کسی طرح بھی سننے کے روادار نہ تھے (لیکن قرآن مجید کا چھوڑنا صرف اسی قدر نہیں) بلکہ قرآن کا چھوڑنا یہ بھی ہے کہ اس پر ایمان نہ لایا جائے اور اس کی تصدیق نہ کی جائے اور اس پر غور وفکر نہ کیا جائے اور اس پر عمل نہ ہو۔ اس کے احکام کی پیروی نہ ہو جن چیزوں سے اس نے روکا ہے ان سے بچنے کی کوشش نہ کی جائے اور اسی کے ساتھ ساتھ اس کو نظر انداز کرکے شعروشاعری، لوگوں کے خیالات، گیت گانے، بیہودہ باتیں اور لہو ولعب اور اس طریقہ زندگی کی پیروی کی جائے جو اسے نظر انداز کرکے بنایا گیا ہو۔ (تفسیر ابن کثیر ۳/)

فہم قرآن کا طریقہ

قرآن مجید کو سمجھنے کا طریقہ افراد واشخاص کے اعتبار سے بدل جائے گا۔

(۱) جو لوگ عربی زبان سرے سے نہیں جانتے وہ قرآن مجید کا ترجمہ اور اس کی تفسیر پڑھنے کا التزام کریں اور جو مسائل درپیش ہوں ان کے حل کے لیے علماء کی جانب رجوع کریں۔

ارشاد رسولؐ ہے: ان القرآن لم ینزل یکذب بعضه بعضا بل یصدق بعضه بعضا فما عرفتم عنه فاعملوا به وماجهلتم فردوه الى عالمه (مسند الامام احمد والحدیث حسن)

قرآن اس لیے نہیں نازل ہوا ہے کہ اس کے بعض حصے بعض کو جھٹلائیں بلکہ ایک دوسرے کی تصدیق کے لیے نازل ہوا ہے لہٰذا جو مفہوم تمہیں سمجھ میں آئے اس پر عمل کرو اور جو نہ آئے اس کو اس کے عالم کی جانب لوٹاؤ۔

عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: قرآن مجید کی جو آیات تم پر گڈمڈ ہو جائیں انھیں ان کے عالم کے حوالہ کرو۔ (فضائل القرآن، ابوعبید/ ۹۹)

نیز ایسے لوگوں کے لیے فہم قرآن میں دروس قرآن کے حلقوں میں شرکت سے بھی کافی مدد ملے گی۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے دروس قرآن کے حلقات میں شرکت کی فضیلت یوں بیان کی ہے:

"مااجتمع قوم فی بیت من بیوت الله یتلون کتاب الله ویتدارسونه فیما بینهم الا نزلت علیهم السکینة وغشیتهم الرحمة وحفتهم الملائکة وذکرهم الله فیمن عنده" (صحیح الجامع الصغیر/ ۵۵۰۹)

کوئی بھی قوم اللہ کے کسی گھر میں اکٹھا ہو کر کتاب اللہ کی تلاوت اور باہم اس کے معانی کا مطالعہ نہیں کرتی مگر ان پر سکینت نازل ہوتی ہے اور رحمت الٰہی انھیں ڈھانپ لیتی ہے اور فرشتے انھیں گھیر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کا تذکرہ ان لوگوں کے درمیان کرتے ہیں جو لوگ اس کے پاس ہیں۔

(۲) عربی زبان سے معمولی واقفیت رکھنے والوں کے لیے فہم قرآن کا طریقہ درج ذیل ہے:

الف: حسن استماع

ارشاد باری ہے "الذین یستمعون القول فیتبعون أحسنه اولٰئك الذین هداهم الله" (الزمر: ۱۸) جو لوگ کلام الٰہی کو سنتے ہیں اور پھر اس کے عمدہ ترین مفہوم کی اتباع کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی ہے۔

سورۃ الاعراف میں ہے "واذا قرئ القرآن فاستمعوا له وأنصتوا لعلکم ترحمون" (۲۰۴) جب قرآن پڑھا جائے تو اسے سنو اور خاموشی اختیار کرو، شاید کہ تم لوگوں پر رحم کیا جائے۔

حسن استماع سے مراد اعضاء وجوارح کا ساکن ہونا اور کانوں کا کلام الٰہی کی جانب حضور قلب کے ساتھ متوجہ ہونا اور عمل کا ارادہ ہونا ہے۔

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں ’’علم کی ابتداء استماع سے ہوتی ہے پھر فہم کا درجہ ہے پھر حفظ پھر عمل پھر اشاعت‘‘ (الجامع لاحکام القرآن ۱۱/ ۱۷۶)

ب: فہم معانی کے لیے شوق وذوق

آیات کی تلاوت کے وقت جو الفاظ مشکل نظر آئیں انھیں لغت یا تفسیر کی کتابوں میں دیکھیں یا اہل علم سے پوچھ لیں۔

"لمن کان له قلب" (ق: ۳۷) کی تفسیر کرتے ہوئے زجاج کہتے ہیں یعنی جس کا دل فہم آیات کے لیے شوق رکھتا ہو۔ (مفتاح دارالسعادۃ: ۲۰۳)

لہٰذا معانی آیات کی جانب متوجہ ہونا، جدوجہد کرنا اور لسان حال ومقال کے ذریعہ سوال انتہائی ضروری ہے کیونکہ سوال کرنے والے ہی آیات اور عبرتوں سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

"لقد کان فی یوسف واخوته آیات للسائلین" (یوسف: ۷)

ج: سچی طلب وخواہش

معانی قرآن کی جانب متوجہ ہونا اور اس سے خیر وبھلائی طلب کرنا مطلوب ومقصود کو پانے

کا اہم ترین ذریعہ ہے۔ اگر قرآن کو سمجھنے کی سچی طلب ہوگی تو اللہ تعالیٰ اس کے راستے کو آسان فرمائیں گے۔ ارشاد خداوندی ہے "ولقد یسرنا القرآن للذکر فھل من مدکر" (القمر:۱۷) اور ہم نے قرآن کو ذکر و نصیحت کے لیے آسان کر دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا۔

مطر الوراق نے اس آیت کی یوں تشریح کی ہے: "ھل من طالب علم فیعان علیه" (حلیۃ الاولیاء ابو نعیم ۳/۷۶) کیا ہے کوئی طالب علم کہ اس کی مدد کی جائے۔

مذکورہ بالا امور کے ساتھ درج ذیل اہم اصولوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

[۱] زندہ حقیقت کے طور پر سمجھیے۔ [۲] کل کے ایک جزو کے طور پر سمجھیے۔ [۳] مربوط، یکجا متن کے طور پر سمجھیے۔ [۴] اپنے مکمل وجود کے ساتھ سمجھیے۔ [۵] قرآن جو بتاتا ہے اسے سمجھیے۔ [۶] متفق علیہ آراء کی حدود میں سمجھیے۔ [۷] صرف قرآنی معیارات سے سمجھیے۔ [۸] قرآن کو قرآن سے سمجھیے۔ [۹] حدیث اور سیرت سے سمجھیے۔ [۱۰] عربی زبان سے سمجھیے۔

نزول قرآن کا بنیادی مقصد ہی اس کی آیات پر تدبر اور عمل ہے، اسی لیے شریعت نے درج ذیل امور کی تلقین کی ہے۔

۱- تجوید اور حسن صوت کے ساتھ تلاوت (صحیح البخاری/۷۵۴۷) اس سے دل میں آیات کی تعظیم اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔

۲- تہجد کی نماز میں تلاوت قرآن کا حکم۔

۳- تلاوت کی غلطیوں اور خامیوں سے بچانے اور تجوید کو عمدہ کرنے کا حکم۔

۴- تلاوت قرآن کے وقت تعوذ کا حکم۔

۵- حسن استماع کا حکم۔

۶- جہری تلاوت کا استحباب

۷- تلاوت آیات کے وقت اس بات کا لحاظ پسندیدہ ہے کہ آغاز وہاں سے کیا جائے جہاں سے کوئی نیا مضمون شروع ہو رہا ہو اور اختتام اس آیت پر کیا جائے جہاں کوئی مضمون ختم ہو رہا ہو۔ (تدبر القرآن، عمر السنیدی)

موانع تدبر

۱- دلوں کے امراض اور گناہوں پر اصرار "ساصرف عن آیاتی الذین یتکبرون

فی الارض بغیر الحق" (الاعراف:۱۴۶)

۲- دل کا تلاوت کے وقت کسی اور کام میں مشغول ہونا۔

۳- خشوع و خضوع کو صرف چند آیات پر محصور کر دینا۔

۴- تلاوت پر اکتفا اور تدبر پر اس ڈر سے متوجہ نہ ہونا کہ کہیں یہ بلا علم کے اللہ پر کسی بات کو کہنے میں داخل نہ ہو جائے۔ یہ شبہ درست نہیں ہے۔ اگر چہ قرآن معجزہ ہے لیکن عبرت و نصیحت کے لحاظ سے ہر شخص کے لیے آسان ہے۔ البتہ استنباط احکام علماء و مجتہدین کے لیے خاص ہے۔

۵- قرأت قرآن کی فضیلت و اہمیت کے پیش نظر صرف تلاوت قرآن پر اپنے عزم کو موقوف کرنا۔

۶- آیات قرآن کو گزشتہ اقوام و ملل کے ساتھ خاص ماننا یا یہ گمان کرنا کہ نزول قرآن کا زمانہ گزر گیا اور موجودہ حالات آیات کے معانی و مفہوم میں داخل نہیں۔ لہٰذا قاری کو چاہیے کہ وہ یہ گمان کرے کہ قرآن کے ہر خطاب کا مقصود وہ خود ہے۔

(۳) طالبان شریعت اور علماء و مجتہدین کے لیے فہم قرآن کا طریقہ

۱- تجوید و ترتیل کے ساتھ مجرد متن کی تلاوت اور پھر اس پر تدبر و تفکر۔ آیت کا مفہوم متعین کرنے میں اس کے حروف و کلمات کے ساتھ ساتھ چلا جائے، کوئی لفظ مہمل نہ چھوڑا جائے۔

۲- قرآنی آیات کو سب سے پہلے خود قرآن کے ذریعہ سمجھا جائے کیونکہ کوئی آیت اگر کہیں مجملاً وارد ہے تو دوسرے مقام پر مفصل، کہیں مطلق ہے تو دوسری جگہ مقید، کہیں عام ہے تو دوسری جگہ مخصص۔ اسی لیے قرآن کو متشابہ اور مثانی کی صفت سے نوازا گیا ہے۔

"الله نزل أحسن الحديث كتاباً متشابها مثانی" (الزمر:۲۳)

ابن عباسؓ کہتے ہیں "قرآن کے بعض حصے بعض کے مشابہ اور بعض بعض پر منطبق ہوتے ہیں۔ (ابن کثیر ۷/۹۴)

۳- قرآن کے بعد احادیث نبویہ کی جانب رجوع کیا جائے کیونکہ آپ کی اہم ترین ذمہ داری قرآن مجید کی قول و عمل کے ذریعہ تبیین ہی تھی۔ (النمل) نماز کا طریقہ، مناسک کا طریقہ، نصاب زکوٰۃ وغیرہ کی تفصیلات حدیث ہی میں بیان ہوئی ہے۔

۴- لغت عربی کی جانب رجوع، چونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے، لہٰذا اس کے معانی و مفاہیم کی معرفت کے لیے نزول قرآن کے عہد میں رائج زبان سے مدد لی جائے گی اور پھر

مفردات قرآن کی تشریح کے لیے پہلے خودقرآن کی جانب رجوع کیا جائے گا اور لفظ کے استعمالات کا تتبع کرکے اس کا معنی متعین کیا جائے گا اور پھر عرب کے قدیم کلام (نظم ونثر) سے استفادہ کیا جائے گا۔جیسا کہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: غریب قرآن کے معانی کو اشعار میں تلاش کرو کیونکہ شعرہی عربوں کا دیوان ہے۔(البرہان فی علوم القرآن، الزرکشی ۱/۲۹۳)

البتہ شاذ معانی سے احتراز کیا جائے گا، وہ معنی لیا جائے گا جو کلام عرب میں متداول رہا ہو جیسا کہ علامہ طبریؒ نے لکھا ہے۔(جامع البیان، الطبری ۸/۵۷۸)

اشعار عرب کے علاوہ عربی زبان کی بنیادی لغات سے استفادہ کیا جائے گا۔

۵-مفرادت کی تحلیل کے بعد آیات کے اعراب پر غور۔

اعراب قرآن کے لیے اعراب القرآن کی اساسی کتابوں کی جانب رجوع کیا جائے گا۔
واضح رہے کہ اعراب کی معرفت کے بغیر آیات کا صحیح فہم ممکن نہیں اور اس میں غلطی سے آیات کا پورا مفہوم غلط ہوسکتا ہے۔

۶-سیاق قرآن اور نظام قرآن کا لحاظ

فہم قرآن میں سیاق اور مناسبت آیات یا نظام کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ ہرسورہ کا کوئی بنیادی محور ہوتا ہے جس کے گرد تمام آیات گھومتی ہیں، اس کی معرفت سے کلام کے مقتضیات واضح ہوں گے، وجوہ بلاغت آشکارا ہوں گے، آیات کی تاویل میں شدید اختلاف کی صورت میں سیاق و نظام سے اختلاف کو ختم کرنے اور صحیح تاویل تک پہنچنے میں مدد ملے گی۔(امعان النظر فی نظام الآی والسور ص۱۱۹)

۷-اسلوب قرآن سے واقفیت

قرآن مجید کا اپنا ایک انداز بیان ہے جو اشعار، خطب، امثال عرب وغیرہ سے مختلف ہے اور اس کا یہی منفرد اسلوب بیان ہے جو بغور سننے والے کو مسحور کردیتا ہے اور اس کے قلب ودماغ کو گھر کرلیتا ہے۔لہٰذا ان اسالیب سے واقفیت کے بغیر قرآن کے وجوہ اعجاز کو پالینا ممکن نہیں۔

فہم قرآن میں صحابہ وتابعین کے تفسیری اقوال سے بھی کافی مدد ملے گی کیونکہ نزول وحی کے وقت وہ حاضر تھے، اس وقت کے احوال وظروف سے واقف تھے۔لہٰذا آیات کے مفاہیم کی توضیح جتنے عمدہ طریقہ سے وہ کرلیں گے بعد کے لوگ نہیں کرسکتے۔(مقدمہ فی اصول التفسیر: ۹۵)

کتب تفاسیر کی جانب رجوع بھی فہم قرآن میں کافی مدد دے گا نیز سیرت وتاریخ اور خصوصاً انبیاء کرام اور ان کی اقوام کی تاریخ سے واقفیت بھی فہم قرآن میں مدد دے گی کیونکہ قرآن مجید

میں جابجا اقوام سابقہ کے احوال، انبیاء کے تئیں ان کے موقف کا تذکرہ ہے اور متعدد تاریخی واقعات کی جانب اشارہ ہے۔

تمسک بالقرآن ھی رفعت و عزت کا ذریعہ

مسلمانوں کی موجودہ صورتحال کسی سے پوشیدہ نہیں، اس قعر مذلت میں امت کے گرنے کا بنیادی سبب قرآن مجید سے دوری اور اس کو چھوڑ دینا ہی ہے۔مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں کہ ’’مالٹا کی چارسالہ جیل سے رہائی کے بعد ایک روز دارالعلوم میں علماء کے بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے حضرت (شیخ الہند مولانا محمودالحسن صاحب دیوبندی) نے مسلمانوں کی تباہی کے اسباب بیان فرمائے [ایک قرآن مجید کی تعلیمات کو چھوڑنا اور دوسرا باہمی اختلافات اور جنگ وجدال] حضرت شیخ الہند نے فرمایا: اسے کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

اب اس ذلت ورسوائی سے نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قرآن مجید کی تعلیمات کو اپنی زندگیوں میں نافذ کیا جائے اور ظاہر ہے فہم قرآن کے بغیر ان تعلیمات سے واقفیت ممکن نہیں۔قرآن کی جانب واپسی ہی اس ملت کی عزت وسربلندی کا واحد ذریعہ ہے۔امام مالکؒ فرماتے ہیں ’
’لایصلح حال آخر ھذہ الامة الا بما صلح به أولها وماصلح أولها الا بالقرآن‘‘ (العودۃ الی القرآن) اس امت کے آخر کے احوال اسی چیز کے ذریعہ درست ہوں گے جس کے ذریعہ اس امت کے اوائل کے احوال درست ہوئے تھے اور اوائل امت کے احوال قرآن مجید ہی کے ذریعہ درست ہوئے تھے۔

چنانچہ خود قرآن مجید نے اپنی ایک صفت ’’مجید‘‘ بیان کی ہے جس کے معنی ہیں عظمت و شرف والا۔چنانچہ یہ قرآن اپنے پڑھنے والے اور عمل کرنے والوں کو عظمتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔

قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر ہے:

’’انه لذكر لك ولقومك وسوف تسألون‘‘ (الزخرف:۴۴) یقیناً یہ قرآن آپ کے لیے اور آپ کی قوم کے لیے باعث شرف وفخر ہے۔

ذکر کے معنی شرف کے بھی آتے ہیں (الکشاف ۴/۲۵۴) یعنی یہ قرآن پوری دنیا میں آپ کو اور آپ کی قوم کو شرف وعزت عطا کرے گا۔

نبی کریم ﷺ نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے:

’’ان الله يرفع بهذا الكتاب أقواما ويضع به آخرين‘‘ (مشکوٰۃ) اللہ تعالیٰ اس کتاب

کے ذریعہ کتنی قوموں کو عروج اور بلندی بخشیں گے اور کتنی قوموں کو زوال وپستی میں لے جائیں گے۔

لہٰذا دنیا وآخرت میں کامیابی کے حصول کے لیے، عزت وسربلندی کے حصول کے لیے، اقوام عالم کی قیادت ورہنمائی کے لیے، قرآن مجید کے حقوق اور خصوصاً فہم قرآن کی لو کو جلانا ہوگا۔ آج بھی امت مسلمہ اگر اپنے نبی کی وصیت "ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ ﷺ" کو نافذ کردے اور اپنے اہل وعیال پر اس وصیت کی تنفیذ کردے تو دنیا وآخرت کی کامیابی اس کا قدم چومے گی۔

فہم قرآن کو عام کرنے کے وسائل و ذرائع

فہم قرآن کو عام کرنے کے لیے درج ذیل وسائل وذرائع اختیار کرنا بہتر ہوگا:

(۱) ہر مسلمان اس بات کی کوشش کرے کہ وہ روزانہ صبح وشام اپنے بچوں کے سامنے چند یا کم از کم ایک آیت کے معانی ومفاہیم کو بیان کرے اور اس طرح بچپن ہی سے ہم اپنے بچوں کے دلوں کو قرآن کے معانی سے بھر دیں تاکہ ہمارے بچوں کے ذہن ودماغ قرآنی افکار وخیالات سے اس طرح بھر جائیں کہ وہ فہم قرآن کی اس تحریک کو گھر گھر پہنچانے کے جذبہ سے سرشار ہوجائیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"جردوا القرآن لیربوفیہ صغیرکم ولا ینأی عنہ کبیرکم" (فضائل القرآن، ابوعبید/۳۲) صرف قرآن کو ہر طرح کی آمیزش سے پاک کرکے بیان کروتا کہ قرآنی فضا میں تمہارے بچے پروان چڑھیں اور بڑے بھی اس سے دور نہ ہوں۔

(۲) دوست واحباب کی مجلسوں میں قرآنی آیات اور اس کے معانی پر گفتگو تاکہ ایک چراغ سے ہزاروں چراغ جلتے ہیں کہ کہاوت صادق آئے اور ہمارا معاشرہ فہم قرآن اور عمل بالقرآن کی تحریک سے مکمل طور پر جڑ جائے۔

(۳) فہم قرآن کے فوائد اور اس کی فضیلت پر مشتمل پمفلٹ اور کتابچے تیار کرکے ہر ہر گاؤں اور بستی میں اسے پہنچایا جائے۔

(۴) ائمہ مساجد کو اس جانب متوجہ کیا جائے کہ مسجد کے پڑوس میں قرآن کی تعلیم کو عام کرنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کو اس امر پر پھٹکار لگائی تھی کہ آپ کے پڑوس میں بعض قبائل آخر علم دین سے جاہل کیسے رہ گئے۔

(۵) اخبارات وجرائد کا استعمال۔ آج ہر آدمی اخبار کا مطالعہ ضرور کرتا ہے۔ قرآنی

آیات کی مختصر تشریح اگر ان اخبارات میں دی جائے تو فہم قرآن کی تحریک کو فروغ ملے گا۔

(۶) انٹرنیٹ کے ذریعہ قرآنی آیات کے معانی وتشریح کو عام کیا جائے اور ہر اجتماعی موقع پر اس فکر کو عام کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۷) اہل خیر حضرات، کسی حافظ قرآن اور قرآنی علوم کی تحصیل میں لگے طلبہ وطالبات یا معلّمہ ومعلمین کی کفالت کے ذریعہ نہ صرف فہم قرآن کی تحریک کو بڑھا سکتے ہیں بلکہ یہ چیز ان کے لیے صدقہ جاریہ بھی بن جائے گی۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"سبع یجری للعبد اجرھن و ھو فی قبرہ بعد موتہ (۱) من علم علما (۲) او اجری نھرا (۳) او حفر بئرا (٤) أو غرس نخلا (٥) او بنی مسجدا (٦) او ورث مصحفاً (۷) او ترك ولدا یستغفر لہ بعد موتہ" (صحیح الجامع الصغیر) سات چیزوں کا اجر بندے کو اس کے مرنے کے بعد قبر میں جاری کیا جاتا ہے؛ (۱) جس نے کوئی علم پھیلایا (۲) نہر کھدوائی (۳) کنواں کھدوایا (۴) کھجور کا درخت لگایا (۵) مسجد بنائی (۶) مصحف ترکہ میں چھوڑا (۷) کوئی اولاد چھوڑی جو اس کی موت کے بعد اس کے حق میں استغفار کرے۔

(۸) ہر ہفتہ گاؤں کے ہر محلے میں، کھلی جگہ پر کسی بلیک بورڈ پر ایک 'آیت' اس کا ترجمہ اور مختصر تشریح لکھ دی جائے تاکہ ہر گزرنے والا ایک لمحہ رک کر اسے پڑھ سکے اور ایک ہفتہ تک اس کو باقی رکھا جائے اور پھر آئندہ ہفتہ دوسری آیت مع ترجمہ وتشریح لکھی جائے۔

(۹) قریہ قریہ علماء قرآن کو مدارس ومعاہد کی جانب سے بھیجا جائے جو فہم قرآن کی تحریک کو مشن کے طور پر آگے بڑھائیں۔

(۱۰) ہر مسجد اور اسکول میں درس قرآن کا اہتمام کیا جائے۔ کیونکہ اس سے فہم قرآن کی تحریک کو عام کرنے میں بے حد مدد ملے گی خود جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں آکر آپ ﷺ کے ہمراہ قرآن کا باہم مطالعہ کرتے تھے۔ عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

"کان رسول اللہ ﷺ أجود الناس وکان أجود ما یکون فی رمضان حین یلقاہ جبرئیل وکان جبرئیل یلقاہ فی کل لیلۃ من رمضان فیدارسہ القرآن، فلرسول اللہ ﷺ أجود بالخیر من الریح المرسلۃ" (رواہ مسلم ۲۳۰۷)

فہم قرآن کے مظاہر

فہم قرآن کی تحریک اگر قریہ قریہ عام ہوجائے تو دنیا ایک بار پھر "رھبان باللیل و

فرسان بالنہار" (رات میں راہب وزاہد اور دن میں شہ سوار) کا منظر دیکھے گی اور پھول کی طاقت، امانت و دیانت کا غلبہ، صداقت وراست بازی اور شجاعت اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جاں نثاری وفداکاری کا منظر دیکھے گی اور یہ بھی دیکھے گی کہ ایک عورت تن تنہا صنعاء سے مکہ کا سفر کررہی ہے اور اللہ کے علاوہ کسی اور کا خوف نہیں ہوگا۔ لوگ اپنی زکوٰۃ وصدقات کو لے کر نکلیں گے اور کوئی لینے والا نہیں ملے گا۔ حضور قلب کے ساتھ قرآن پڑھنے والے اس سے کیسے متاثر ہوتے ہیں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- ابوطلحہ انصاریؓ نے جب "لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون" [آل عمران:۹۲] (تم ہرگز نیکی کو نہیں پاسکتے جب تک اپنی محبوب ترین چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کردو) تو آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا 'بیرحاء' کا باغ میرا سب سے قیمتی مال ہے تو اے اللہ کے رسول یہ اللہ کے لیے صدقہ ہے، آپ جہاں چاہیں خرچ کریں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ کافی قیمتی مال ہے، اسے تم اپنے رشتہ داروں میں صدقہ کردو، چنانچہ انھوں نے اپنے چچازاد بھائیوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کردیا۔ (صحیح البخاری: ۲۷۵۸)

۲- اور ابن عمرؓ نے جب یہ آیت سنی اور اس پر غور کیا تو اس وقت آپ کے پاس سب سے قیمتی مال 'مرجانہ' نام کی ایک باندی تھی تو آپ نے اسے اللہ کے لیے آزاد کردیا۔ (فتح الباری ۲۲۴/۸)

۳- زید بن حارثہؓ نے اس آیت کو سننے کے بعد اپنے پاس موجود ایک گھوڑے کو اللہ کی راہ میں صدقہ کردیا۔ (تفسیر الطبری ۵۹۲/۶)

۴- اصمعی کہتے ہیں کہ میں کوفہ کی جامع مسجد سے آرہا تھا ایک اعرابی سے ملاقات ہوئی، اس نے پوچھا کہاں سے آرہے ہو؟ میں نے کہا جامع مسجد سے، اس نے کہا: چند آیات کی تلاوت کیجئے، میں نے سورہ الذاریات کی تلاوت کی اور جب "وفی السماء رزقکم وما توعدون" پر پہنچا تو اس نے کہا بس کیجئے اور اپنی قوس وکمان توڑ دی اور اونٹنی کو کاٹ کر فقراء ومساکین میں تقسیم کردیا۔ ایک زمانہ کے بعد میں ہارون رشید کے ہمراہ حج کرنے گیا تو دیکھا کہ وہ عبادت کی وجہ سے بالکل نحیف ولاغر ہوگیا ہے، اس نے پھر قرأت کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے تلاوت شروع کی اور جب اعرابی نے 'فورب السماء والارض انہ لحق مثل ما انکم تنطقون' (الذاریات: ۲۳) سنی تو چیخ اٹھا اور فرمایا: ہائے سبحان اللہ! کس نے رب جلیل کو غصہ کردیا یہاں تک کہ اس نے قسم کھائی، کیا لوگوں نے اس کے قول کی تصدیق نہ کی۔ (الجامع لاحکام القرآن، القرطبی ۴۲/۱۷) ☆

جہیز یا وراثت

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی ☆

نسل انسانی کی افزائش وبقا، فطری وطبعی تقاضوں کی تکمیل، عصمت وعزت کی حفاظت اور دل ودماغ کے سکون اور راحت کے لیے نکاح ایک ضرورت بلکہ اسلام کی نگاہ میں ایک عبادت ہے، اس ضرورت وعبادت کی ادائیگی کے لیے ضروری ہے کہ اسے آسان سے آسان تر بنایا جائے، اس میں کسی طرح کی دقت اور دشواری نہ ہو۔ چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

ان اعظم النکاح برکۃ ایسرہ مؤنۃ (امشکاۃ المصابیح ۹۳۰/۲) سب سے بابرکت نکاح وہ ہے جو سب سے کم خرچ ہو۔

مرد کی فطرت اور بالادستی کا لحاظ رکھتے ہوئے نکاح کے خرچ کو اس کے ذمے رکھا گیا ہے اور عورت اور اس کے سرپرست کو ہر طرح کے خرچ سے سبکدوش رکھا گیا ہے، چنانچہ مرد کے لیے مہر کو لازم قرار دیا گیا ہے اور اس کے لیے ولیمہ کو سنت کہا گیا ہے، ایسے ہی بیوی کی کفالت اور نفقہ کا اسے ذمہ دار گردانا گیا ہے اور مالی خرچ کا ذمہ دار ہونے کی وجہ سے اسے عورت پر بالادستی دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم (۲سورۃ النساء/۳۴) مرد عورتوں پر حاکم ہیں، اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں۔

اور حدیث میں ایسے ہی شخص کے لیے نکاح کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے جو بیوی کے اخراجات کو برداشت کرسکے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے

☆استاذ حدیث وفقہ، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

فرمایا:

یامعشر الشباب من استطاع منکم الباء ة فلیتزوج فانه أغض للبصر وأحصن للفرج۔ نوجوانو!تم میں سے جو نکاح کا خرچ اٹھا سکتا ہے وہ نکاح کرلے کیونکہ اس کی وجہ سے نگاہ جھک جاتی ہے اور شرمگاہ کی حفاظت ہوتی ہے۔(صحیح بخاری۲/ ۷۵۸، صحیح مسلم۱/ ۴۴۹، ملاعلی قاری نے ’’من استطاع منکم الباءۃ‘‘ کی تشریح میں لکھا ہے کہ ای مؤنۃ الباءۃ من المھر والنفقۃ یعنی مہر اور نفقہ کا خرچ دینے کی استطاعت رکھتا ہو۔مرقاۃ المفاتیح ۳/ ۴۰۲)

نکاح کے لیے عورت کے گھر والوں پر مالی بوجھ لادنا اور ان سے جہیز کا مطالبہ کرنا نہ صرف اسلامی تعلیم کے خلاف ہے بلکہ فطرت سے بغاوت اور انسانیت سے گری ہوئی حرکت ہے اور اس طرح سے جو مال حاصل کیا جاتا ہے وہ باطل اور ناجائز ہے۔

اسلام میں اس طرح کے رسم کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے عربوں میں ہزار برائیاں تھیں لیکن اس دریوزہ گری کا کوئی تصور تک نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب وسنت میں بلکہ فقہی کتابوں میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا ہے اور اس کے برخلاف صراحتاً مردوں کو نکاح کے لیے مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

واحل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا بأموالکم (سورۃ النساء/۲۴)ان عورتوں کے سوا دوسری عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں یعنی یہ کہ تم اپنے مال کے ذریعہ انھیں حاصل کرو۔

لہٰذا عورت یا اس کے سرپرست پر مال خرچ کرنے کی ذمہ داری ڈالنا صراحتاً اس آیت کی خلاف ورزی ہے۔ چاہے مال خرچ کرنے کی وجہ رسم ورواج اور سماج کا خوف ہو یا لڑکے کی طرف سے مطالبہ دونوں کا حکم یکساں ہے۔

مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ گھر بسانے کے لیے ضروری چیزوں کا انتظام کرے، چنانچہ

فقہی کتابوں میں اس طرح کے مسائل ملتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نسبتی باپ کے پاس کچھ رقم اس لیے بھیج دیتا ہے کہ وہ اس سے دلہن کے لیے سامان عروسی کا نظم کرے اور عورت کے لیے ضروری چیزیں خرید کر اس کے ہمراہ بھیج دے مگر وہ کسی وجہ سے اسے نہ بھیج سکا تو شوہر کو اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے۔(ردالمحتار۴/۳۱۰) بلکہ انتہا یہ ہوگئی کہ کچھ لوگ اپنے ہونے والے داماد سے مہر کی رقم کے علاوہ اپنے لیے رقم کا مطالبہ کرنے لگے چونکہ یہ ایک غیر شرعی مطالبہ تھا اس لیے اس دور کے فقہاء نے پرزور انداز میں اس ’’رسم بد‘‘ کی تردید کی اور کہا کہ یہ ’’رشوت‘‘ کے حکم میں ہے اور ’’سحت‘‘ ہے(البحر الرائق ۳/۲۰۰، ردالمحتار ۵/۲۷۲)

عورت کے سرپرست کی طرف سے اس طرح کے مطالبے کو ایک حد تک معقول کہا جا سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے لخت جگر کو جسے خون سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے غیر کے حوالے کر رہا ہے، اس لیے وہ حق پرورش کے طور پر اپنے لیے کچھ رقم کا مطالبہ کرے تو ایک حد تک بات سمجھ میں آنے والی ہے لیکن عورت کے سرپرست کے بجائے مرد کی طرف سے اس طرح کا مطالبہ، شاید ہی دنیا میں اس سے زیادہ غیر معقول کوئی بات ہو، اس کے ’’رشوت‘‘ اور ’’سحت‘‘ ہونے میں کیا شبہ ہے۔

’’رشوت‘‘ ایک عام فہم لفظ ہے اور اس سے متعلق یہ روایت بھی بہت مشہور ہے کہ

لعن اللہ الراشی والمرتشی (رواہ ابوداؤد وابن ماجہ، مشکوٰۃ ۲/ ۱۰۸ وقال الالبانی صحیح) اللہ نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت کی ہے۔

البتہ ’’سحت‘‘ کا لفظ غیر معروف ہے، اس لیے اس کی وضاحت کی ضرورت ہے، مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین شامی نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

حرام اور خبیث کمائی کو ’’سحت‘‘ کہتے ہیں جسے لیتے ہوئے شریف انسان عار محسوس کرے۔(ردالمحتار ۵/۲۷۲)

اور ’’سحت‘‘ کے سلسلے میں یہ سخت وعید آئی ہے:

لایدخل الجنة لحم نبت من السحت وکل لحم نبت من

السحت فالنار اولی به (رواه احمد والدارمی، مشکاۃ ۲/ ۸۴۵) جس جسم کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا اور ایسے جسم کے لیے جہنم کی آگ زیادہ بہتر ہے۔

لہٰذا جہیز کو تحفہ کا نام دیا جائے یا کچھ اور کہا جائے، بہرصورت وہ رشوت کے حکم میں ہے اور اس کا واپس کرنا ضروری ہے، چنانچہ فقہ کی کتابوں میں اسی سے ملتا جلتا ایک مسئلہ ملتا ہے کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاق دی اور عورت دوبارہ اس کے نکاح میں آنا چاہتی ہے، اور شوہر کہتا ہے کہ میں تم سے اسی شرط پر نکاح کروں گا کہ میرے ذمہ جو مہر باقی ہے وہ مجھے ''ہبہ'' کردو، عورت نے نکاح کے لیے سابق مہر کو ''ہبہ'' کردیا۔ فقہاء کرام کہتے ہیں کہ یہ ''ہبہ'' باطل ہے اور اس کی وجہ یہ لکھی گئی ہے۔

عورت نے شوہر سے نکاح کے لیے مال کو عوض قرار دیا ہے حالانکہ نکاح میں عورت پر کوئی عوض نہیں ہے۔ (فتاویٰ قاضی خان ۱/ ۳۷۸، فتاویٰ ہندیہ ۱/ ۳۱۷)

واقعہ یہ ہے کہ مروجہ جہیز کے لیے کتاب وسنت اور فقہ کی کتابوں میں کوئی بنیاد موجود نہیں ہے بلکہ یہ قرآن وحدیث کی تصریحات کے خلاف ہے اور رشوت کے حکم میں ہے۔ اسے لینا حرام اور نادرست ہے اور لینے کے بعد واپس کرنا ضروری ہے کیونکہ لینے والا، اس کا مالک نہیں بن سکتا ہے۔ (ردالمحتار ۴/ ۳۰۴)

رہا یہ کہ بعض روایتوں میں حضرت فاطمہ کو جہیز دینے کا تذکرہ ہے جیسا کہ امام نسائی نے حضرت علیؓ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

جهز رسول الله ﷺ فاطمة فی خميل وقربة و وسادة حشوها اذخر (سنن نسائی ۲/ ۹۲) اللہ کے رسول ﷺ نے فاطمہ کو ایک چادر، پانی بھرنے کے لیے مشک اور ایک تکیہ بطور جہیز دیا تھا جس میں اذخر گھاس بھری ہوئی تھی۔

لیکن اس سے مروجہ جہیز کے جائز ہونے پر استدلال کرنا غلط ہے، کیونکہ حضرت علی بچپن

ہی سے آنحضور ﷺ کی زیر سرپرستی رہے، رسول اللہ ﷺ کے گھر میں آپ کی پرورش اور تربیت ہوئی اور نکاح کے وقت تک آپ ﷺ کے ساتھ رہے۔ چنانچہ تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ

وہ ہمیشہ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ رہے...... یہاں تک کہ فاطمہ سے ان کا نکاح ہوگیا۔ (الاستیعاب ۱/ ۳۸)

نیز حضرت علیؓ کو ان کے باپ ابوطالب کے کفر کی وجہ سے وراثت میں سے بھی کوئی حصہ نہیں مل سکا تھا (موطأ امام مالک/ ۳۰۰) بے سروسامانی کی حالت یہ تھی کہ نکاح کے بعد آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ مہر کی رقم میں سے کچھ فاطمہ کے حوالے کردو تو انھوں نے کہا کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے ماعندی شیء (سنن ابی داؤد، ۱/ ۳۰۶) اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے جو کچھ دیا وہ بطور سرپرست گھر بسانے کا انتظام تھا، دوسرے یہ کہ بعض روایتوں میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مذکورہ سامان کا نظم حضرت علی کی زرہ بیچ کر کیا تھا۔ (زرقانی شرح مواہب اللدنیہ ۳/ ۲۰۳، الطبقات لابن سعد ۸/ ۱۹)

یہ کوئی مروجہ جہیز نہیں تھا کیونکہ عربوں میں نہ تو اسلام سے پہلے اس طرح کا کوئی رواج تھا اور نہ طلوع اسلام کے بعد اس کے علاوہ کوئی مثال ملتی ہے اور نہ آج وہ اس سے ہم آشنا ہیں، نیز آپ ﷺ کی متعدد صاحب زادیاں تھیں لیکن کسی اور کے نکاح کے موقع پر کچھ دینے کا تذکرہ نہیں ملتا، رہا حضرت زینب کو ہار دینے کا واقعہ تو وہ ان کی والدہ حضرت خدیجہ نے اسلامی شریعت کے نزول سے پہلے دیا تھا اس لیے اسے بھی دلیل بنانا صحیح نہیں ہے (سیرت ابن ہشام ۱/ ۶۵۱) اس لیے اللہ کے رسول ﷺ کا حکم ہے کہ

فاتقوا الله واعدلوا بين اولادكم (صحیح بخاری ۱/ ۳۵۳) اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل سے کام لیا کرو۔

ایک دوسری روایت میں ہے کہ کسی صحابی نے اپنے ایک لڑکے کو کچھ تحفہ دیا اور اس پر آنحضرت ﷺ کو گواہ بنانا چاہا، آپ نے پوچھا کہ دوسرے لڑکوں کو بھی یہ تحفہ دیا ہے انھوں نے کہا کہ نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ظلم پر گواہ نہ بناؤ۔ (حوالہ مذکور ۱/ ۳۶۱)

حضرت فاطمہ اور زینب کے واقعہ کو جہیز کے خانے میں رکھا جائے تو رسول اللہ ﷺ کی طرف ظلم اور ناانصافی کی نسبت کرنی ہوگی، حالانکہ آپؐ کی ذات سے یہ ناممکن اور محال ہے، اس لیے لامحالہ یہ ماننا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت فاطمہؓ کو جو کچھ دیا وہ حضرت علیؓ کے سرپرست ہونے کی وجہ سے یا انھیں کی زرہ بیچ کر دیا۔

جہیز ایک ایسی لعنت ہے جس کی تباہ کاری بتانے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ ہر شخص اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرسکتا ہے اور کر رہا ہے اور ہر روز اس پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھا اور سنا جاتا ہے، یہاں تک کہ بھارتی حکومت نے بھی اسے جرم قرار دے رکھا ہے لیکن ان سب کے باوجود یہ وبا جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جارہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ برائی ایک دوسری خرابی سے وابستہ ہے اور وہ ہے عورتوں کو وراثت سے محروم رکھنا، ایک باپ اپنی بیٹی کو اپنی حیثیت سے بڑھ کر جہیز دینے کے لیے آمادہ ہے لیکن جب وراثت کی بات آتی ہے تو وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتا ہے، اپنی جائداد کو دس بیٹوں میں تقسیم کردینا گوارا کرلیتا ہے لیکن ایک بیٹی کے لیے اس میں سے کچھ نہیں ہے، حالانکہ وراثت میں جس طرح سے مردوں کا حصہ ہے اسی طرح سے عورتوں کا بھی ہے ۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

للرجال نصيب مما ترك الوالدان والاقربون وللنساء نصيب مما ترك الوالدان والاقربون مما قل منه او كثر نصيبا مفروضا (سورۃ النساء/۷) ماں باپ اور رشتہ داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں مردوں کا حصہ ہے اور ماں باپ اور رشتہ داروں نے جو کچھ چھوڑا ہے اس میں عورتوں کا بھی حصہ ہے، چاہے کم ہو یا زیادہ، ایک متعین حصہ ہر ایک کے لیے ہے۔

اور ہر ایک کے متعین حصے کو بیان کرنے کے بعد کہا گیا ہے:

تلك حدود الله ومن يطع الله ورسوله يدخله جنات تجری من تحتها الانهار خالدين فيها وذالك الفوزالعظيم ومن

يعص الله ورسوله ويتعد حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين (سورۃ النساء/۱۳-۱۴) یہ اللہ کے حدود ہیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی بات مانے گا تو اللہ انھیں ایسے باغات میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کے حدود کو پار کرے گا تو اسے اللہ آگ میں داخل کریں گے جس میں ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے قانون وراثت سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے اور عورتوں میں شعور پیدا کیا جائے کہ وہ اپنے حق کے لیے اٹھ کھڑی ہوں کیونکہ جہیز کو وراثت کا بدلہ سمجھا جاتا ہے، ہندوؤں کے یہاں عورتوں کا کوئی حصہ نہیں ہے، اس لیے وہ شادی کے موقع پر جہیز کے نام پر کچھ دے کر سبک دوش ہوجاتے ہیں، لہٰذا ایک ایسے معاشرہ میں جہاں عورتوں کے مطالبہ وراثت کو بغاوت سمجھا جاتا ہو، وہاں سے جہیز کی برائی ہرگز نہیں مٹ سکتی جب تک کہ قانون وراثت کو نافذ نہ کیا جائے اور جب تک حقداروں کی حق تلفی ہوتی رہے گی، اللہ کی متعین کردہ حدوں کو توڑا جاتا رہے گا جہیز اور تلک کی شکل میں ذلت آمیز عذاب مسلط رہے گا۔

☆☆☆

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

حدیث اور مستشرقین

انیس احمد مدنی ☆

استشراق کی تعریف

استشراق، شرق سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں مشرق کے، استشراق کے معنی ہوں گے مشرق کو چاہنا یعنی مشرق کے علوم و عادات، ثقافتوں اور تقالید کو چاہنا اور ان کا مطالعہ کرنا۔ تشریق کے معنی ہیں: مشرق کی جانب سے پکڑنا۔ سورۃ الحجر ۷۳ میں ہے فأخذتھم الصیحۃ مشرقین صبح سویرے چیخ نے انھیں آ پکڑا۔ (اساس البلاغۃ، جاراللہ ابوالقاسم محمود بن عمر الزمخشری ۱/ ۴۸۸)

اصطلاحی تعریف

لفظ استشراق جدید اور نیا لفظ ہے، جس کے اصطلاحی معنی لغوی معنی ہی کی جانب لوٹتے ہیں، چنانچہ استشراق کے معنی ہوں گے، مشرق اور مشرقی دنیا کا علم اور مستشرق کا لفظ ہر اس مغربی عالم و محقق کے لیے مستعمل ہے جو پورے مشرق کو اپنی بحث کا موضوع بنائے۔ مشرق اوسط کو یا ابعد کو، یعنی مغرب کا رہنے والا ہر وہ عالم جو مشرقی لغات و آداب، تہذیبوں اور مذاہب کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنائے۔ (الاستشراق والخلفیۃ الفکریۃ للصراع الحضاری: ڈاکٹر محمود حمدی زقزوق، سلسلۃ کتاب الامۃ، عدد صفر الخیر ۱۴۰۴ھ، ص ۱۸، التبشیر والاستشراق احقاد وحملات، المتشار محمد عزت الطھطاوی، طبعۃ مجموع البحوث الاسلامیہ ۱۹۷۷ء ص ۳۵)

استشراق کا آغاز

استشراق کا آغاز کب ہوا، محققین کی رائیں مختلف ہیں۔ بعض کہتے ہیں دسویں صدی عیسوی میں، بعض تیرہویں صدی اور بعض گیارہویں صدی کو مانتے ہیں۔ البتہ منظّم طور پر اس کا آغاز بریطانیہ میں ۱۷۷۹ء میں اور فرانس میں ۱۷۹۹ء میں ہوا۔ (بین الاسلام والغرب: ڈاکٹر علی عبدالوہاب ۱۹۸۰ء، الاستشراق: تاریخہ وأھدافہ، احمد شلبی مکتبۃ النھضۃ المصریۃ ۱۹۹۶ء ص ۲۰، الاستشراق والخلفیۃ الافکریۃ للصراع الحضاری: ڈاکٹر محمود حمدی زقزاق ص ۲۰)

☆ استاذ حدیث وتقابل ادیان، جامعۃ الفلاح، اعظم گڑھ

استشراق کے ظہور کا تاریخی پس منظر

شام و فلسطین اور مصر کے رومی سلطنت سے نکل جانے کی بنا پر عیسائی حلقوں اور کلیسا میں عربوں اور اسلام کے تئیں دشمنی و عداوت کے جذبات پروان چڑھے، ان علاقوں میں عیسائیوں کے تین اہم اور بنیادی کلیسا واقع تھے، اسکندریہ کا کلیسا، انطاکیہ کا کلیسا اور بیت المقدس ان مقدس علاقوں کی واپسی کے لیے کلیسا کی کوششوں سے صلیبی جنگوں کا آغاز ہوا، جن میں ناکامی نے ان کے مفکرین کو اس نتیجہ پر پہنچادیا کہ عالم اسلام کی قوت واستحکام محض شمشیر وسناں کی بدولت نہیں بلکہ اس میں نظریاتی عنصر کا بڑا حصہ ہے۔ ریمنڈس نے سقوط کرہ (۱۲۹۱ء) کے بعد کلیسا کو دعوت دی کہ ''علوم شرقیہ کے مطالعہ کو روحانی صلیبی جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جائے'' چنانچہ پندرہویں صدی عیسوی میں اس نظریہ پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا گیا، پوپ اور اس کے بشپ اس یک طرفہ سرد جنگ کو تیز کرنے کے لیے سرگرم ہوگئے۔ بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، اغراض و مقاصد کا تعین ہوا، طریقہ کار طے کیے گئے، علوم شرقیہ کے با مقصد مطالعہ کا دور شروع ہوا، یونیورسٹیوں سے علوم شرقیہ کے ماہرین پیدا ہونے لگے، جن کا متعینہ مقصد یہ تھا کہ وہ عیسائیت کی ترویج اور اسلام کی بیخ کنی کے لیے خود کام کریں اور دوسروں کو مواد بہم پہنچائیں۔

استشراق کے اہم اہداف

۱- اقوام مغرب کو اسلام کی صحیح روشنی سے محروم کرنا کہ کہیں مغربی اقوام بھی، شام و مصر اور اسپین کے مسیحیوں کی طرح ایمان نہ لائیں اور اس کی صف میں شامل نہ ہوجائیں۔

۲- اسلام کو نظریاتی اعتبار سے کمزور کرنا اور مغربی اقدار و افکار کی برتری اسلامی افکار پر ثابت کرنا۔

۳- استعماری مقصد، مشرقی علاقوں کی سماجی، سیاسی اور تاریخی معلومات کے ذریعہ ان علاقوں پر اپنے غلبہ وتسلط کو مستحکم کرنا۔

۴- اقتصادی مقصد، مشرق کے خام مواد پر قبضہ اور پورے مشرق کو مغرب کی عالمی مارکیٹ میں تبدیل کرنا۔

۵- علمی مقصد، مغربی نوجوانوں کے سامنے عمل کے نئے میدانوں کو وا کرنا

فن حدیث سے مستشرقین کا شغف

استشراق کے ابتدائی دور میں قدیم مستشرقین نے سنت پر کوئی مستقل بحث نہیں کی ہے،

ان کی بحث وگفتگو عقیدہ، قرآن اور سیرت وتاریخ میں ہی محدود رہی ہے۔

سب سے پہلے سترہویں صدی کے آغاز میں فرانس کے رہنے والے Herbelot De (۱۶۳۵ء-۱۶۹۵ء) نے مشرق سے متعلق اپنے انسائیکلو پیڈیا ''المکتبۃ الشرقیۃ'' میں حدیث کے تعلق سے ایک باب مختص کیا ہے، یہ انسائیکلو پیڈیا ۱۷۳۸ء میں شائع ہوا ہے۔ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ ''کتب ستہ موطأ، سنن الدارمی، سنن الدارقطنی، سنن البیہقی اور علامہ سیوطی کی کتابوں میں موجود احادیث زیادہ تر تالمود سے ماخوذ ہیں۔ نیز انھوں نے عملی احادیث اور مجرد تاریخی روایات واحادیث کے درمیان فرق کرنے کی بھی کوشش کی ہے، نیز ان کا خیال ہے کہ دین اسلام اصلاً یہودیت اور جزیرۃ العرب میں موجود دیگر مذاہب وادیان سے ماخوذ ہے۔

اٹھارہویں صدی میں مستشرقین نے مشرقی علوم وفنون کو موضوعاتی اور فنی لحاظ سے مطالعہ بحث بنایا ہے اور اس صدی کے آغاز میں درج ذیل تین مستشرقین نے سنت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

۱-امیر کا یتانی Caetani (۱۸۶۹ء-۱۹۲۶ء)

۲-میور Muir (ت:۱۹۰۵ء)

۳-شپر نجر، اسپرنگر Sprenger (ت:۱۸۹۳ء)

کا یتانی نے اپنی ''حولیات'' میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ متون احادیث میں سندوں کا اضافہ عروۃ بن الزبیر اور محمد بن اسحاق کے بیچ کے عہد میں کیا گیا ہے، عروہ سندوں کا التزام نہیں کرتے تھے جبکہ محمد بن اسحاق نے سندوں کا ناقص التزام کیا ہے۔

میور کے نزدیک احادیث کی تصحیح میں سندوں پر اعتماد درست نہیں کیونکہ سند میں بیچ میں راویوں کا اضافہ ممکن ہے، البتہ وہ بعض احادیث کو صحیح مانتے ہیں اور صحیح بخاری کی نصف احادیث کو انھوں نے صحیح اور معتبر قرار دیا ہے۔

اسپرنگر کے نزدیک اسناد کا نظام مضبوط بنیادوں پر قائم نہیں ہے، حدیث کو سند اور متن سے مل کر ماننے کی بناء پر بڑی افراتفری پیدا ہوئی ہے اور عروۃ بن الزبیر کی سندیں گھڑی ہوئی ہیں البتہ خطیب البغدادی کی کتاب ''تقیید العلم'' کی بنیاد پر وہ اس بات کے قائل ہیں کہ احادیث عہد نبوی ہی میں لکھی ہوئی موجود تھیں۔

ان تینوں سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے اجناس گولڈ زیہر (Ignas Gold Ziher) نے نقد کے تاریخی منہج کا استعمال کرتے ہوئے احادیث پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ زیہر نسلاً

یہودی اور مجر کا رہنے والا تھا (۱۸۵۰ء-۱۹۲۰ء)۔ جامعہ ازہر سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی۔ مستشرقین اسے حدیث کے درایتی وتنقیدی مطالعہ کا رائد اول تصور کرتے ہیں اور اس کی آراء کو بحث و تنقید سے بالاتر گمان کرتے ہیں۔

زیہر اگر چہ چند احادیث کو اصلی اور معتبر مانتا ہے اور عہد صحابہ میں حدیث کے بعض صحیفوں کے موجود ہونے کا بھی اعتراف کرتا ہے لیکن اس کا یہ خیال ہے کہ زیادہ تر احادیث دوسری اور تیسری صدی میں کلامی اور مسلکی گروپوں نے اپنے مذاہب کی ترویج وتقویت کے لیے وضع کی ہیں نیز حدیث کی تدوین کا آغاز دوسری صدی ہجری میں ہوا۔

عہد اموی کی انھوں نے اس طرح منظر کشی کی ہے کہ اس کے ظالم و جابر حکمرانوں اور محبان اہل بیت اور متقی علماء کے درمیان مسلسل نزاع اور رسہ کشی چل رہی تھی۔اس نے امام زہریؒ پر یہ الزام بھی لگایا ہے کہ انھوں نے "لاتشد الرحال الا الی ثلثة مساجد" والی حدیث اموی حکمرانون کے اشارہ پر گھڑی ہے اور اسلام کے اصول وعقائد، یہودیت وعیسائیت سے ماخوذ ہیں اور ہیلینی فلسفہ کی چھاپ اس پر موجود ہے اور اسلامی فقہ رومن فقہ سے ماخوذ ہے۔

بعد میں آنے والے اکثر مستشرقین نے زیہر کے مذکورہ بالا آراء سے اتفاق کیا ہے اور اس کے کچھ نئے انطباقات کا تذکرہ کیا ہے جیسے کیولیوم (Cullaume)، نیکلسون (Nickolson) اور ھایلٹون گب (Gibb)، واٹ (Watt) اور ونسنک (Vensink) (ت:۱۹۲۹ء) ونسنک نے اپنی کتاب The Muslim Creed میں عقیدہ سے متعلق احادیث پر گفتگو مرکوز رکھی ہے۔صرف بعض مستشرقین نے اس کی بعض آراء پر تنقید کی ہے جیسے فیوک Fueck (۱۹۳۹ء) اور ہوروفٹس Horofytz (۱۹۳۱ء) اور روبسون۔

ھوروفٹس (۱۸۷۴ء-۱۹۳۱ء) نے عروہ کی سندوں کا اعتبار کیا ہے اور آپ کا خیال ہے کہ راویان حدیث نے پہلی صدی ہجری کی چوتھی دہائی میں سندوں کا التزام کیا ہے۔

روبسون (۱۸۹۰ء) میں پیدا ہوئے، مانچسٹر یونیورسٹی میں ۱۹۴۹ء سے استاذ رہے ہیں، آپ نے کا یتانی اور شپرنجر کے اس قول سے اتفاق نہیں کیا ہے کہ عروۃ بن الزبیرؓ (۹۳) سندیں جعلی ہیں، متاخرین نے گھڑلی ہیں۔ نیز آپ نے شاخت کے برخلاف اس بات کو ثابت کیا ہے کہ احادیث کے ذخیرہ کی ایک بڑی تعداد کی اصل واساس موجود ہے۔

بیسویں صدی کے ایک اہم محقق جنھیں مستشرقین خاتمۃ المحققین کے لقب سے نوازتے

ہیں جوزیف شاخت ہیں Schacht (مولود: ۱۹۰۳ء) جنھوں نے فقہی اوراحکامی احادیث کواپنی گفتگواور بحث وتحقیق کا موضوع بنایا ہے اورآپ کی درج ذیل دو کتابیں اس باب میں تنقید سے بالاتر گمان کی جاتی ہیں۔

۱-شریعت محمدیہ کے اصول۔اصول الشریعۃ المحمدیۃ

The Origin of Muhammadan Jurisprudence

۲-اسلامی فقہ کا تعارف Introduction of Islamic Law

شاخت نے اپنی کتاب شریعت محمدیہ کے اصول میں موطأ امام مالک اورالام للشافعی کا تفصیلی مطالعہ کرکے جن نتائج کو حاصل کیا ہے، اس کو جملہ کتب احادیث پر عام کردیا ہے، اس کا خیال ہے کہ سندیں ۱۵۰ھ سے پہلے موجود نہ تھیں اور زیادہ تر احادیث کوفقہاء اوراصحاب فرق نے گھڑلیا ہے اورامام شافعی پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے ''حجیت حدیث'' کے نظریہ کو عام کیا اوران سے پہلے عمل مسلکی ومذہبی سنتوں پر قائم تھا۔

شاخت مستشرقین کے یہاں انتہائی مستنداورقابل اعتماد مانے جاتے ہیں۔ پروفیسر گب نے آپ کی کتاب اصول الشریعۃ کے بارے میں فرمایا کہ: مستقبل میں یہ کتاب مغرب میں اسلامی تہذیب وشریعت کے ہرمطالعہ کی اساس و بنیاد ہوگی۔(H.A.R. Gibb, Journal of Comprative Legislation and International Law, Vol. 33 P. 114)

جامعہ لندن میں فقہ اسلامی کے استاذ کولسون کہتے ہیں کہ: شاخت نے اسلامی شریعت کے اصول وضوابط کے جونظریات پیش کیے ہیں وہ عمومی لحاظ سے تنقید سے بالاتر ہیں۔شاخت نے متعدد مستشرقین پر اثرات ڈالے ہیں جیسے پروفیسر انڈرسون، روبسون، فیزرجرالڈ، کولسون، بوزورث۔

مغربی تہذیب کے علمبردار متعدد عالم ومحققین بھی شاخت کے نظریات سے متاثر ہیں جیسے فیضی،فضل الرحمٰن اورنیازی وغیرہ۔

جامعہ لندن اورکیمبرج یونیورسٹی میں شاخت کے کسی بھی نظریہ پرتنقید کی گنجائش نہیں ہے۔

☆☆☆

جامعہ کے لیل ونہار

عبدالرقیب فلاحی

شیخ ماجد عبدالغنی البکری کا خطاب

۲۰/مارچ ۲۰۱۳ء جامعہ کی مسجد میں جامعہ کے طلبہ ونمازیوں کی کثیر تعداد سے خطاب کرتے ہوئے عرب مہمان اورمشہور داعی شیخ ماجد عبدالغنی البکری حفظہ اللہ نے کہا کہ: جھوٹ، وعدہ خلافی،غیبت،حسد، دھوکہ، بہتان تراشی، چغل خوری، بدکاری جیسے اعمال اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں، کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ اعمال فاسدہ آج ہمارے معاشرے میں عام ہوگئے ہیں، ہم کس منہ سے اسلام کی دعوت لوگوں کو دیں گے، جبکہ ہمارے اعمال خود ہی سیاہ ہوگئے ہیں یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ آج ہماری زندگی اسلام کے اشاعت کی راہ میں رکاوٹ بن گئی ہے۔

انھوں نے کہا کہ اسلام صرف زبانی جمع خرچ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقہ پرگذارنے کا نام ہے،قرآن میں صرف عقیدہ اورایمان ہی کی تعلیم نہیں ہے بلکہ اس کے مطابق عمل اوراخلاق کی تاکید بھی ہے۔دین میں معاملات کی بڑی اہمیت ہے، اگرکوئی روزہ نماز کی پابندی کرتا ہے اوراس کے معاملات ٹھیک نہیں ہیں تو وہ اللہ کی رضا کا مستحق نہیں ہوسکتا ہے۔انسان کواپنی زبان کا استعمال بھی احتیاط کے ساتھ کرنا چاہیے۔ بسااوقات زبان سے نکلی ہوئی ایک بات انسان کو جہنم تک پہنچا دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جوشخص اپنی زبان اورشرم گاہ کی حفاظت کی ضمانت دے تو میں اسے جنت کی بشارت دیتا ہوں۔آدمی کو ہمیشہ سچ بولنا چاہیے اور زبان کے غلط استعمال سے بچنا چاہیے۔

محترم موصوف نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو موقع ملا ہے، اس سے فائدہ اٹھایئے اوراپنے اساتذہ سے بھرپوراستفادہ کیجئے اور مستقبل کے لیے خود کو تیار کیجئے۔علم واخلاق کواپنا ہتھیار بنائیں۔اپنے والدین کی عزت وتکریم کریں اوران کے خدمت کے ذریعہ جنت حاصل کریں۔انھوں نے مزید کہا کہ اگرآپ اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں گے تو آپ کی اولاد بھی آپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گی۔

اس موقع پر جامعہ کے مرکز الدعوۃ میں برادران وطن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، جس میں کوئی نقص نہیں۔ اس موقع پر قصبہ واطراف کے درجنوں برادران وطن نے موصوف کے خطاب سے استفادہ کیا۔

جامعہ کے کلیۃ البنات میں معلمات وطالبات کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اسلام نے عورت کو بہت اونچا مقام دیا ہے۔ اس لیے آپ کو بھی نئی نسل کی تعلیم وتربیت اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ اللہ اوراس کے رسولؐ کے اصولوں کو اپنا سکیں، حضرت عائشہ صدیقہؓ مشکل اوقات میں صحابہ کرام کی بھی رہنمائی کیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ تاریخ میں جتنی بھی شخصیات کا تذکرہ آتا ہے انھیں اس مقام تک پہنچانے میں خواتین کا اہم کردار تھا حتی کہ امام شافعیؒ کو ان کی ماں نے تیار کیا تھا۔

شیخ ماجد عبدالغنی حفظہ اللہ نے مزید فرمایا کہ دین کی خدمت کی اہم ذمہ داری تبھی ادا ہوسکتی ہے جب آپ کے اندر تعلیم ہو اور تعلیم کے لیے جدوجہد کی ضرورت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنے رشتہ کو مستحکم اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ایمان کے بغیر خیر کا کوئی تصور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ انھوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی بدعت کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسے لوگوں کو نرمی سے سمجھانے کی ضرورت ہے۔ دعوت کے کام کو صبر وتحمل سے انجام دینے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اس کام میں فائدہ ہی فائدہ ہے، کوئی خسارہ نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ نے اس کام کو ۹۵۰ سال تک انجام دیا اور نتیجہ کی پرواہ نہیں کی۔

شیخ عبدالحمید جاسم البلالی -حفظہ اللہ- کا جامعہ میں خطبہ جمعہ

۱۲/اپریل بروز جمعہ جامعہ کی مسجد میں مشہور عالم دین ومعروف داعی شیخ عبدالحمید بلالی نے خطبہ جمعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسلام جس تیزی سے اخلاق و کردار کے ذریعہ پھیلا، اس رفتار سے کسی اور طریقے سے نہیں پھیلا۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے: انی بعثت لاتمم مکارم الاخلاق مجھے مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے ہی مبعوث کیا گیا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک سب سے پسندیدہ وہ شخص ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔

محترم موصوف نے خطبہ کے دوران کہا کہ اخلاق سے متاثر ہوکر اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد ہر زمانے میں زیادہ رہی ہے اور آج بھی اس طرح کے واقعات آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔ جرمنی کے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا جو ایک مسلمان کے یہاں اس کے مہمان نوازی کے عمل سے متاثر ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوا تھا۔ انھوں نے مزید کہا کہ دین محض نماز، روزہ اور حج کی ادائیگی کا

نام نہیں ہے بلکہ دین عبادت واخلاق اور کردار کا نام ہے۔ دین میں یہ باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں کہ لوگوں کے ساتھ ہمارا سلوک ومعاملہ کیسا ہے؟ اس لیے ہمیشہ ہر ایک سے حسن اخلاق سے پیش آنا چاہیے اور کلی طور پر برے اخلاق اور گندے خیالات سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر ہمارے رہن سہن اور اخلاق میں غیر مسلموں سے فرق نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اندر دین کی کمی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام تو انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں کے ساتھ بھی صلہ رحمی سے پیش آنے کی تلقین کرتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ موجودہ عہد کے مسلمانوں کا اخلاق اسلام کی اشاعت میں بڑی رکاوٹ ثابت ہورہا ہے۔

الفلاح ہاسپٹل کی پہلی منزل کا افتتاح بدست شیخ عبدالحمید جاسم بلالی

۱۳/اپریل ۲۰۱۳ء بروز سنیچر ۹ بجے صبح الفلاح ہاسپٹل کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ جس کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا، اس کے بعد محترم ناظم جامعہ نے استقبالیہ خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ درجنوں کتابوں کے مصنف وداعی الشیخ عبدالحمید جاسم بلالی جنھوں نے سیکڑوں لیکچر دنیا کے مختلف ممالک میں دیا ہے ہم ان کا اور ان کے ساتھ آئے ہوئے مہمانان کا استقبال کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ پورے علاقہ کے لیے یہ اسپتال مثالی بنے۔ آئندہ اس کا دائرہ طبیہ کالج تک وسیع کرنے کا عزم ہے اس کے بعد اسپتال کے ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد عارف صاحب نے اسپتال کی کارکردگی پیش کرتے ہوئے کہا کہ ۲۰۱۱ء میں اسپتال کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس چھوٹی سی مدت میں اسپتال نے نمایاں ترقی کی ہے، یہاں ایلوپیتھی، ہومیوپیتھی، آیورویدک اور یونانی کے ڈاکٹروں کی خدمات دستیاب ہیں۔ اس طرح اپنی نوعیت کا یہ منفرد ہاسپٹل ہے جس کی مثال بمشکل ہی ملے گی۔ آج تک تین ہزار سے زائد غرباء کا مفت علاج کیا جاچکا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مواضعات میں مفت طبی کیمپ لگائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا کہ نبی کریمؐ نے خدمت خلق کو ایمان کا جز قرار دیا ہے۔ صحت مند جسم میں صحت مند دماغ پروان چڑھتا ہے اور اسی سے صحت مند سماج وجود میں آتا ہے۔ ہمارا مقصد صحت مند سماج پیدا کرنا ہے، ہمارے یہاں ہر قوم کے لوگ علاج کرانے آتے ہیں، یہ اسپتال تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے کھولا گیا ہے۔ اس موقع پر محترم ناظم جامعہ نے شیخ بلالی صاحب کو مومنٹو پیش کر کے ان کا استقبال کیا۔ اس کے علاوہ کویت سے آئے ہوئے دیگر مہمانان کی خدمت میں شال پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد شیخ عبدالحمید جاسم بلالی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کویت کے لوگوں نے الفلاح ہاسپٹل کے قیام میں جو تعاون دیا ہے وہ

کوئی احسان نہیں ہے۔ ہندوستان کے لوگوں نے ہمارے اجداد کے ساتھ اچھا سلوک کیا تھا جب کویت وعرب میں غربت تھی تو اس وقت ہند کے امراء ورؤساء اور عوام نے کافی تعاون کیا ہے، اس لیے ہندوستان کے لوگوں کا ہم پر حق ہے۔ محترم موصوف نے مزید کہا کہ انسانوں کی خدمت ہی اسلام ہے۔ یہ اسپتال تمام انسانوں کے لیے کھلا ہے، پوری دنیا ایک کنبہ ہے۔ اسلام کا پیغام محبت کا پیغام ہے، نبی ساری دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے جو لوگ رحم ومحبت کا معاملہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کے اوپر رحم کرتا ہے۔ نبی کریمؐ نے انسانوں ہی نہیں بلکہ جانوروں، نباتات وجمادات کے ساتھ بھی حسن سلوک کا پیغام دیا ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ اسپتال اسلام کی تبلیغ واشاعت کا مرکز بنے اور روز بروز ترقی کرے۔ انھوں نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس اسپتال میں تعاون کرنے والی ایک کویتی خاتون کا چند روز قبل انتقال ہوگیا ہے۔ مرحومہ نے جو کوششیں کی ہیں اللہ تعالیٰ انھیں اس کا اجر دے گا اور قیامت تک کے لیے صدقہ جاریہ کے طور پر قبول فرمائے گا۔

کلیۃ البنات میں شیخ عبدالحمید جاسم البلالی کا خطبہ

۱۳/اپریل ۲۰۱۳ء بروز سنیچر کلیۃ البنات میں ''الوقت ھوالحیاۃ'' کے عنوان پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ جو نعمتیں ہمیں دنیا میں ملی ہیں ان میں سب سے قیمتی نعمت وقت ہے، جو اپنا وقت ضائع کرتا ہے وہ یقیناً اپنی قیمتی شے برباد کرتا ہے ایسے لوگ نادان ہیں، ذرا سوچیے کہ اسی طرح وقت گذرتا جائے گا اور موت کا فرشتہ آجائے گا اور وقت ختم ہوجائے گا۔ اسلام نے وقت کو بہت اچھے طریقہ سے پہچانا ہے۔ اس کی اہمیت کا بیان قرآن کریم میں موجود ہے۔

شیخ بلالی نے کہا کہ قرآن کے اندر نمازوں کے وقت کے ساتھ ساتھ دیگر عبادتوں کی تفصیل بھی موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام میں وقت کی کیا اہمیت ہے۔

شیخ بلالی کی کلیۃ البنات آمد کے موقع پر بچیوں نے ترانہ پیش کرکے مہمانان کا استقبال کیا اور محترمہ ساجدہ فلاحی صاحبہ (معاون مہتمم کلیۃ البنات) نے کلمات تشکر پیش کیا۔

تعلیمی بیداری کانفرنس کا انعقاد

۲۸-۲۹/اپریل کو جامعۃ الفلاح میں پلاننگ کمیشن کے ممبر مولانا فضل الرحیم مجددی کے تعاون سے دوروزہ تعلیمی بیداری کانفرنس (سچر کمیٹی کے چھ سال بعد) کا انعقاد ہوا، جس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا فضل الرحیم مجددی نے کہا کہ سچر کمیٹی کے چھ سال بعد اب وقت آگیا ہے کہ مسلمان سرکاری نظام سے اپنا حق حاصل کرنے کے لیے منظم کوشش کریں۔ منصوبہ بندی کمیشن سے

جو فنڈ اقلیتی بہبود کے منصوبوں کے لیے مختص ہو رہا ہے اس سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے سیاسی نمائندوں سے جواب طلب کریں۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی رضاکار تنظیمیں قائم کرکے حکومت وانتظامیہ سے رجوع کرنا سیکھیں، انھوں نے کہا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ آنے کے بعد مسلمان مزید پسماندہ ہوئے ہیں۔

مسلم اداروں کے ذمہ داروں کا ورکشاپ

''سچر کمیٹی کے چھ سال بعد'' عنوان پر منعقد دوروزہ سیمینار کے آخری دن قرب وجوار کے مسلم اداروں کے ذمہ داروں کا ایک ورکشاپ ابواللیث ہال میں منعقد ہوا، جس کی صدارت مولانا فضل الرحیم مجددی صاحب نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے انجام دئے۔

مولانا فضل الرحیم مجددی صاحب نے فرمایا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ تب ہی کارآمد ہوگی جب مسلمان اس میں دلچسپی لیں گے۔ مسلمانوں میں این جی او قائم کرنے کی بے حد ضرورت ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ آجانے سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ پلاننگ کمیشن نے مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی لینا شروع ہی نہیں کردیا ہے بلکہ اس کے لیے اقدام بھی کررہا ہے۔ مسلمانوں میں ترقی کے لیے ضلع سے لے کر تحصیل، بلاک اور گاؤں تک فلاحی ادارے اور این جی او قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمان جذبات کو ترک کرکے سنجیدہ ہوکر کام کریں اور مستقبل کو روشن بنانے کے متعلق فکرمند ہوں۔ مسلمانوں کی ۵۳ فیصد آبادی یوپی، بہار، بنگال اور آسام میں آباد ہے مگر انھیں علاقوں میں مسلمان پسماندہ ہیں، اس کے برعکس جنوب کی ریاستوں میں مسلمانوں کی حالت بہتر ہے۔ مسلمانوں کے مسائل تب تک حل نہ ہوں گے جب تک پاور سینٹروں پر بہتر نمائندگی نہ ہوگی۔ مسلمانوں کو عدالت پر زیادہ یقین کرنا چاہیے۔ اعظم گڑھ پر جو مصیبت آئی ہے اس کا دفاع عدالتی طور پر کیا جانا چاہیے۔ دہلی سے آئے مہمان محمد بلال نے کہا کہ مرکزی حکومت کی اقلیتوں کے لیے ۱۵ اسکیمیں ہیں جس میں سب سے آسان وظیفہ حاصل کرنا ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ نے یہ ثابت کردیا ہے کہ ۹۰ فیصد مسلمان اپنے بچے کو پڑھا نہیں سکتے ہیں کیونکہ وہ غریب ہیں۔ وظیفہ نہ لینے کی صورت میں جو وظیفہ کے لیے فنڈ آتا ہے وہ کم کردیا جاتا ہے۔

افتخار احمد صاحب سابق پرنسپل شبلی کالج نے کہا کہ اگر حکومت مسلمانوں کی ترقی کے لیے فکرمند ہے تو مسلمانوں کی ترقی کی ذمہ داری مسلمانوں کے ہاتھ میں دی جائے۔ ایک کمیٹی مسلمانوں کی بنائیں جس کے ذریعہ کام ہو کیونکہ آئی اے ایس، آئی پی ایس ودیگر افسران مسلمانوں کے لیے کام کرنے میں رخنہ ڈالتے ہیں۔ اس موقع پر لوگوں نے مختلف قسم کے سوالات کیے جس کا مہمان نے

اطمینان بخش جواب دیا۔ آخرش مولانا محمد طاہر مدنی صاحب نے مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سچر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مختلف جہتوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

علوم حدیث پر لیکچر سیریز

رواں تعلیمی سال میں ایک مفید کام یہ انجام پایا کہ احادیث اور علوم حدیث پر نظر رکھنے والے ماہرین کے ذریعہ ایک لکچر سیریز کا اہتمام کیا گیا۔ بحمداللہ اس سلسلہ سے طلبہ، اساتذہ اور علوم اسلامیہ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو کافی فائدہ پہنچا ہے۔ تفصیلات درج ذیل ہیں:

☆ ۲۷/جنوری ۲۰۱۳ء کو احادیث لکچر سیریز کی پہلی کڑی پیش کی گئی جس کا عنوان تھا ''تدوین حدیث'' جسے مولانا اخلاق احمد کریمی صاحب، استاذ جامعۃ الفلاح نے پیش کیا، لیکچر انتہائی مدلل اور پر مغز تھا۔

☆ ۱۴/مارچ ۲۰۱۳ء کو مولانا اعجاز احمد قاسمی صاحب استاذ جامعۃ الفلاح نے ''حدیث کے موضوع پر تالیف شدہ کتابوں کی اقسام'' کے عنوان سے بہت مفید لیکچر پیش کیا۔

☆ ۱۷/مارچ ۲۰۱۳ء کو اس سیریز کی دوسری کڑی مولانا ولی اللہ مجید قاسمی صاحب استاذ جامعۃ الفلاح نے پیش کیا۔ موصوف کا عنوان ''حجیت حدیث اور اس پر منکرین کے اعتراضات اوران کے جوابات'' لکچر انتہائی پر مغز اور مدلل رہا۔

☆ ۲۳/مارچ ۲۰۱۳ء کو مولانا عمر اسلم اصلاحی صاحب استاذ مدرسۃ الاصلاح نے ''کتب ستہ اوران کی خصوصیات'' کے عنوان پر ایک توسیعی لیکچر پیش کیا، لیکچر عمدہ اور مفید رہا۔

☆ ۱۵/اپریل ۲۰۱۳ء کو مولانا ثاقب مکی صاحب استاذ جامعۃ الفلاح نے ''درایت حدیث'' کے عنوان پر ایک توسیعی لیکچر پیش کیا، لیکچر مفید اور مدلل رہا۔

☆ یکم مئی ۲۰۱۳ء کو مولانا عبدالرحیم ربانی صاحب استاذ جامعہ سلفیہ بنارس نے ''تخریج حدیث، اس کا آغاز ونشو ونما اور اس کے طرق'' کے عنوان پر لیکچر پیش کیا، لیکچر مفید رہا۔

☆ ۲/مئی ۲۰۱۳ء کو ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی صاحب نے توسیعی لیکچر پیش کیا جس کا عنوان تھا ''ادب عربی پر حدیث کا اثر''، لیکچر مدلل اور مفید رہا۔

☆ ۷/مئی ۲۰۱۳ء کو مولانا انیس احمد مدنی صاحب صدر مدرس جامعۃ الفلاح نے توسیعی خطبہ پیش کیا جس کا موضوع تھا ''حدیث اور مستشرقین''، لیکچر انتہائی پر مغز، مدلل اور بہت ہی مفید رہا۔

☆ ۸/مئی ۲۰۱۳ء کو مولانا رئیس احمد فلاحی استاذ جامعۃ الفلاح نے ''شیعہ اور حدیث'' کے عنوان پر ایک چشم کشا لیکچر پیش کیا۔

☆ ۹/مئی ۲۰۱۳ء کو مولانا اسعد اعظمی صاحب استاذ جامعہ سلفیہ بنارس نے لیکچر پیش کیا جس کا عنوان تھا ''سنت کا قرآن سے تعلق''، لیکچر بہت اچھا اور مفید رہا۔

☆ ۱۱/مئی ۲۰۱۳ء کو لیکچر سیریز کی آخری کڑی مولانا محمد طاہر مدنی صاحب ناظم جامعۃ الفلاح نے پیش کیا۔ موصوف کے لیکچر کا عنوان تھا ''علوم حدیث ایک تعارف''، لیکچر بہت مفید اور مدلل رہا۔

توسیعی خطبات

الحمدللہ رواں تعلیمی سال میں ابواللیث ہال میں مختلف تذکیری اور تعزیتی نشستوں کے علاوہ چار علمی خطبات پیش کیے گئے جن کی مختصر روداد ہدیہ قارئین کی جارہی ہے۔

☆ ۱۱/اکتوبر ۲۰۱۲ء کو ناظم جامعہ نے ''دین میں ترجیحات، اہمیت اور تقاضے'' کے عنوان پر ایک توسیعی لیکچر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ دینی احکام کے مابین مراتب کا فرق ہے، ان کا جاننا ضروری ہے تا کہ اہم کو غیر اہم نہ سمجھ لیا جائے۔

☆ ۷/فروری ۲۰۱۳ء کو ناظم جامعہ نے دوسرا لیکچر بعنوان ''کیف یتم النجاح الدراسی'' پیش کیا۔

☆ ۱۱/مارچ ۲۰۱۳ء کو مسلم یونیورسٹی شعبہ ریاضی کے پروفیسر ظفر الحسن نے قرآن اور سائنس کے موضوع پر پر مغز اور مدلل خطاب فرمایا۔

☆ ۱۸/مارچ ۲۰۱۳ء کو مفتی مشتاق احمد بخاری (اسسٹنٹ پروفیسر جامعہ ملیہ) نے ''اثبات اسلام میں صوفیاء کا کردار برصغیر کے تناظر میں'' پیش کیا۔

☆ ۱۲/اپریل کو شیخ عبدالحمید جاسم بلالی نے ''ہمم الرواحل'' کے عنوان پر ایک تحقیقی لیکچر دیا۔

اساتذۂ جامعہ کا ترجمہ - مجلہ حی علی الفلاح کا اجراء

اساتذہ کرام جامعۃ الفلاح نے ''حی علی الفلاح'' کے نام سے اپنا ایک سالانہ ترجمان نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔ جس کا پہلا شمارہ ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آرہا ہے، اس کا بنیادی مقصد مغرب کی فکری یلغار اور تحریک استشراق کے بادسموم سے امت کو بچانا اور نظریاتی وفکری اعتبار سے اسلام کو باطل افکار ونظریات پر غالب کرنا ہے۔ یہ ترجمان دوسو سے زائد صفحات پر مشتمل ہوگا۔ ان شاء اللہ ہر سال یہ مجلّہ شائع ہوتا رہے گا۔

فہرست وفود برائے وصولی رمضان المبارک ۲۰۱۳ء

۱	ماسٹر محمد خالد صاحب مولانا عرفان احمد اعظمی	ممبئی، مدن پورہ، بائی کلہ، بھنڈی بازار، قلابہ، ڈونگری، دادر، کماٹی پورہ، گرانٹ روڈ، جے جے، بوری بندر وغیرہ

۲	مولوی شاہد الاسلام فلاحی ماسٹر محمد یحییٰ صاحب	ممبئی، رے روڈ، ولے پارلے، دھاراوی، سائن، باندرہ، سانتا کروز، ماہم، اندھیری، گورے گاؤں، کاندیولی، گنیش نگر، ملاڈ، جوگیشوری، بوریولی
۳	مولانا افتخار الحسن صاحب معین الدین فلاحی	ممبئی، ساکی ناکہ، کرلہ، گھاٹ کوپر، وکرولی، بھانڈوپ، گونڈی، چمبور، مرول ناکہ، شیواجی نگر، بیگن واڑی وغیرہ
۴	مولانا کمال الدین فلاحی ماسٹر رضی احمد صاحب	ممبئی، میرا روڈ، وسئی، نالہ سپارا، ملت نگر، دادر اور متفرقات
۵	مولوی عرفان احمد فلاحی ماسٹر ریاض احمد صاحب	بھیونڈی مغرب وغیرہ بھیونڈی مشرق کلیان وغیرہ
۶	ماسٹر محمد خالد حنیف	ممبئی، کوسہ، ممبرا، ناسک، پونہ وغیرہ
۷	محمد آصف فلاحی صاحب مولوی نسیم احمد فلاحی	بھساول، مالے گاؤں، کھام گاؤں، جل گاؤں، فیض پور اورنگ آباد، جالنہ وغیرہ
۸	ماسٹر حبیب احمد صاحب ماسٹر جاوید احمد صاحب	احمد آباد، سورت، واپی، بڑودہ بارڈی، بلساڈ وغیرہ
۹	ماسٹر محمد ابراہیم صدیقی، رئیس احمد فلاحی	بنگلور، ہاسن، بھٹکل، اڈپی، ملپے وغیرہ
۱۰	ماسٹر اقبال عالم صاحب مولانا ثاقب علی قاسمی صاحب	مدراس وغیرہ
۱۱	مولانا اخلاق احمد کریمی قاری کوثر جمال صاحب	حیدرآباد، سکندرآباد، نظام آباد وغیرہ
۱۲	مولوی اقرار علی صاحب جاوید اقبال صاحب	بھوپال، ناگپور، چھندواڑا، سیونی وغیرہ
۱۳	ماسٹر نظام الدین صاحب ماسٹر معین الدین صاحب	راجستھان، جے پور، کوٹہ، باراں، مانگرول، سنکیت، بہتیر، گنگاپور وغیرہ
۱۴	ماسٹر توفیق احمد صاحب مولانا جمیل احمد فلاحی	دہلی، غازی آباد، میرٹھ، ہاپوڑ وغیرہ دہلی، سہارنپور، دہرادون، مظفرنگر، کیرانہ، بدایوں، پیلی بھیت، مرادآباد، سنبھل وغیرہ

۱۵	مولانا محمد اسماعیل فلاحی، مولانا اعجاز احمد قاسمی، عبدالرقیب فلاحی	پٹنہ، آرا، سیوان، مظفرپور، بہار شریف وغیرہ
۱۶	قاری محمد مصطفےٰ فلاحی، اقبال احمد اصلاحی	کلکتہ
۱۷	ماسٹر عبدالمالک صاحب صغیر احمد صاحب	ہنگائی پور، علاؤالدین پٹی، جگمل پور، نصیرپور، گلواں، جیراجپور، بندول، سکندرپور، سریاں، مہراج گنج وغیرہ
۱۸	حافظ ارشاد احمد صاحب	درجی، مدھناپار، ٹکریا وغیرہ
۱۹	مولانا ولی اللہ مجید قاسمی مولانا رئیس احمد فلاحی صاحب	علاقہ کشمیر
۲۰	ماسٹر کفیل احمد صاحب، ماسٹر اظفر عزیر صاحب، مولانا محمد عمران فلاحی، قاری زبیر احمد صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب، ماسٹر شہنواز	بلریاگنج، شہاب الدین پور، بھگت پور وغیرہ
۲۱	منشی ریاض الدین	بھدوہی، سرائے میر، پھولپور، مرزاپور، الہ آباد وغیرہ
۲۲	مولانا احسان الحق فلاحی صاحب	اندور، اجین، دیواس وغیرہ
۲۳	شمیم احمد صاحب غازی پوری ثناء اللہ صاحب	بنارس، رامپور، بریلی، علی گڑھ، نینی تال، کانپور، لکھنؤ وغیرہ
۲۴	ماسٹر سید عبداللہ صاحب	شہر اعظم گڑھ، مبارکپور، مئو وغیرہ
۲۵	محمد رضا انور صاحب حافظ عطاء الرحمٰن صاحب	گورکھپور، بستی، دیوریا، بلرامپور، گونڈا، فیض آباد، سلطانپور، بسکھاری، ٹانڈا، مچھلی شہر، جونپور، جلال پور
۲۶	محمد یعقوب صاحب	مئو، کوپاگنج، محمد آباد، مبارکپور، خیرآباد، بندی کلاں
۲۷	مولانا امتیاز احمد فلاحی، ماسٹر محمد عاصم	بھیونڈی
۲۸	مولوی اکمل فلاحی صاحب	بسہم ومضافات
۲۹	ثناء اللہ صاحب	جھارکھنڈ

نوٹ: افراد اور مقامات میں جزوی تبدیلی ہوسکتی ہے۔

☆☆☆